مختصر تاریخ گورکھپور مرتبہ ڈاکٹر احمر لاری تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۷۲، قیمت بارہ پیسے، پتہ:- ادبستان۔ نظام پور، گورکھپور،

یہ مشرقی اترپردیش کے مشہور مقام گورکھپور کی مختصر تاریخ ہے، اردو میں ابھی تک اسکی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ڈاکٹر لاری نے یہ کتابچہ لکھا ہے، اس کے آخر میں ایک مختصر فارسی کتاب "تاریخ معظم آباد" کا اردو ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے، اس میں، انیسویں صدی تک کے واقعات ہی کا ذکر ہے، موجودہ صدی کے واقعات آیندہ اڈیشن میں شائع کئے جائینگے لیکن یہ نہایت مختصر ہے، ممکن ہے آیندہ اڈیشن میں مزید تفصیل سے کام لیا جائے۔

فکری زاویے مرتبہ جناب ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۰۸، مجلد مع گرد پوش قیمت للعہ ناشر نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ،

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ریڈر شعبہ اردو دلی یونیورسٹی نے وقتاً فوقتاً جو ادبی و تنقیدی مضامین لکھے تھے اب انھوں نے انکا مجموعہ شائع کیا ہے، یہ سولہ ۱۶ مضامین پر مشتمل ہے، ابتدا کے تین مضامین میں اردو نظم و نثر ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء اور آزادی کے بعد اردو تحقیق کا جائزہ اور اردو تراجم کے مسائل سے مختصر بحث کی گئی ہے، ایک مضمون میں تحقیق و تنقید کا مفہوم اور ان کی ضروری شرطیں بیان کی گئی ہیں، چھ مضامین میں سودا، سوز، غالب، محسن، جگر اور فیض کی شاعری کے کسی نہ کسی اہم پہلو پر بحث کر کے ان کا درجہ و مرتبہ واضح کیا گیا ہے، دو مضامین میں فراق کی تنقیدی اور اختر اورینوی کی مقالہ نگاری کی خصوصیات نمایاں کی گئی ہیں، آخری مقالہ میں خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ اردو دلی یونیورسٹی کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا، ڈاکٹر ظہیر احمد اردو شعر و ادب کے قدیم ذخیرے کے عظمت شناس بھی ہیں، اور نئے تنقیدی و ادبی رجحانات سے آشنا بھی، اس لئے وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں غور و فکر کے ساتھ اعتدال بھی ہوتا ہے، اور یہ مجموعہ اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لایق ہے۔

(ض)

جلد ۱۱۳ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۳ء عدد ۵

مضامین

تصحیح

صفحہ ۳۶۷ میں عنوان میں لفظ مقام کے بجائے قیام اور سطر ۶ میں اسلامک اسٹڈیز بجائے اسٹڈیز آف اسلام بنالیں،

"ایڈیٹر"

شذرات

گذشتہ مہینہ مصر و شام میں عربوں اور یہودیوں سے پھر ایکبار خونریز جنگ ہوئی، جس کا سردست کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا، محاذ آرائی ابھی جاری ہے، صلیبی جنگ کی طرح اس کا سلسلہ بھی طویل ہوتا نظر آتا ہے، مگر مسلمانوں کو یقین کامل ہے کہ آخر میں فتح عربوں ہی کو ہوگی، کیونکہ کلام پاک میں ہے کہ یہودیوں کو ذلت اور محتاجی کی مار رہے گی، انکی قسمت پر محرومی اور نامرادی کی مہر ہمیشہ کے لئے لگ گئی ہے (البقرہ رکوع ۸) کلام پاک میں انکی شرارت پسندی فتنہ پروری، بے دریغ خونریزی اور ظلم و معصیت کی جفا بندی کا ذکر بار بار آیا ہے، اور بڑی حقارت سے کہا گیا ہے کہ برابر ان کے چہرے پر رسوائی چھیری گئی (بنی اسرائیل رکوع ۱۵) اللہ تبارک و تعالی کا وعدہ ہے کہ ان کے نتائج عمل کا قانون اپنی عقوبتیں دکھلا کر رہے گا (بنی اسرائیل، رکوع ۱)

خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی نافرمانی اور سرکشی سے نالاں ہو کر دعا کی تھی کہ اے میرے پروردگار اپنی ذات خاص اور میرے بھائی ہارون کے سوا کوئی میرے بس کا نہیں، تو عذاب نازل کرتے وقت ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں امتیاز کیجیو، کہیں ہم ان کی لپیٹ میں نہ آجائیں (المائدہ رکوع ۴) مشرق وسطیٰ پر اس وقت عذاب الٰہی نازل ہے، اس کی لپیٹ میں عرب بھی آگئے ہیں اسلئے کہ ان کو معاشرتی، سیاسی اور مذہبی حیثیت سے کیا ہونا چاہئے تھا، اور کیا ہو کر رہ گئے ہیں، جب وہ اپنے کو ہر طرح سے سنوار لیں گے تو اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق یہودیوں کی سرکشی اور فساد کی نحوست اس کی پاداش میں بھی لوٹ آئے گی (بنی اسرائیل رکوع ۱) کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے، کہ اگر تم وہی پہلی سی شرارتیں کروگے تو ہم بھی پھر وہی کریں گے جو پہلے کیا تھا،

یعنی تم کو سزا دیں گے، اور ہم نے کافروں کے لئے جہنم کا جیل خانہ تیار کر رکھا ہے، (بنی اسرائیل ۱)

عہد رسالت ہی سے یہودی مسلمانوں سے مکارانہ جنگ کرتے رہے ہیں، مگر ہمیشہ بشارت الٰہی دی گئی کہ وہ مسلمانوں کو معمولی اذیت اور آزار پہونچانے کے سوا اور کوئی نقصان نہ کر سکیں گے، اور اگر ان کی لڑائی مسلمانوں سے ہوئی تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، اور پھر ان کو کہیں سے مدد نہ ملے گی، (آل عمران رکوع ۱) موجودہ سلسلۂ جنگ میں اگر عربوں نے ایمانی حرارت، اسلامی اخوت اور باہمی یگانگت سے کام لیا تو یہ بشارت پھر پوری ہو کر رہے گی، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا ہے کہ یہودی مصر کے جنگل میں بھٹکتے پھریں گے، تو تم ان نافرمان لوگوں کے حال پر افسوس نہ کرنا (مائدہ رکوع ۵) اس وقت مصر کے سینائی صحرا میں بھٹک رہے ہیں، امریکہ کے سوا ساری دنیا ان کی ہٹ دھرمی پر ان کو مطعون کر رہی ہے، موجودہ دور کے سب سے بڑے مورخ آرنلڈ ٹائن بی نے بھی کہا ہے کہ امریکہ جس روز بھی ان سے نظر پھیر لیگا، وہ خود بخود ختم ہو جائیں گے، جس کے بعد کلام پاک کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوگی، کہ ڈال دی گئی ہے ان پر ذلت جہاں کہیں بھی وہ جائیں بجز اس کے کہ اللہ کی ذمہ داری میں یا اور لوگوں کی ذمہ داری میں (آل عمران رکوع ۱۲) موجودہ جنگ کے بعد دنیا کا سیاسی شعور اس حیثیت سے بیدار ہو چکا ہے کہ اسرائیلی امریکہ کے سہارے کے بجائے عربوں کی ذمہ داری کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، اور اگر وہ امریکہ کے رحم و کرم پر زندہ رہنے کی کوشش کرتے رہے تو یہ بھی کلام پاک کے ارشاد کے مطابق ذلت کی مار اور پناہ ہوگی، لیکن موجودہ جنگ سے ظاہر ہو گیا ہے کہ امریکہ کے فینٹم اسکائی ہاک اور بم کی امداد کے باوجود وہ موت کے منہ میں ڈھکیلے جا سکتے ہیں،

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر عبد المعید خاں کی وفات علمی حلقہ کیلئے

ایک سانحہ ہے، انھوں نے قاہرہ اور کیمبرج میں تعلیم پاکر ساری عمر جامعہ عثمانیہ کی خدمت میں گذاری، کچھ دنوں آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی عربی کے پروفیسر رہے، حیدرآباد کے مشہور انگریزی رسالہ اسلامک کلچر کی ادارت کے فرائض آخر وقت تک بڑی خوبی سے انجام دیئے، مارماڈیوک پکتھال نے اس کا جو معیار قایم کیا تھا، اس کو انھوں نے قایم رکھا، دائرۃ المعارف حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں میں بھی ان کا بڑا حصہ رہا، ان کی رہنمائی میں یہاں سے بہت سی مفید کتابیں شائع ہوئیں، مولانا ابوالکلام آزاد ان کی علمی صلاحیتوں کے معترف تھے، وہ حکومت کی علمی کمیٹیوں میں نامزد ہوتے رہے، جہاں وہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے امید ہے کہ جامعہ عثمانیہ ان کو ایک نامور فرزند کی حیثیت سے برابر یاد رکھے گی،

گذشتہ اکتوبر میں ڈاکٹر تاراچند کے انتقال پُرملال سے بھی ہندوستان میں ایک بڑا علمی خلا پیدا ہوگیا، وہ الٰہ آباد کے کایستھ پاٹ شالہ کی مدرسی اور پرنسپلی کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے، پھر حکومت ہند کے تعلیمی مشیر بنے، ایران میں ہندوستان کی طرف سے سفیر بنا کر بھیجے گئے، وہاں سے واپسی پر پارلیمنٹ کے رکن نامزد کئے گئے لیکن انکی اصلی شہرت اور مقبولیت ایک بلند پایہ مورخ کی حیثیت سے ہوئی، انھوں نے "انفلوانس آف اسلام ان انڈین کلچر" پر ایک مقالہ لکھ کر آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی یہ انکی ابتدائی تحقیقی کوشش تھی، لیکن اس سے بہتر کتاب اس موضوع پر ابتک نہیں نکلی، آخر میں وہ ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ کے بورڈ کے اڈیٹر تھے، ان کی ادارت میں یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام پاتا رہا، ان کی تحقیقی تحریروں میں وسعت نظر کے ساتھ بڑی فراخدلی بھی ہوتی، وہ ہندی اور اردو کی حسین آمیزش یعنی ہندوستانی زبان کے بھی بڑے مویّد تھے، اس کے کچھ اچھے نمونے بھی لکھ کر پیش کرتے رہے، ان کی نیک نامی اور مورخانہ بصیرت کی وجہ سے انکی خوشگوار یادوں کا چراغ علمی حلقہ میں برابر روشن رہے گا،

مقالات

ملا محمود جونپوریؒ

(ب) سوانح حیات کے دیگر ماخذ

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری، ایم اے، ایل ایل بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۲)

زیر بحث موضوع کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم محمد صالح کنبوہ کی "عمل صالح" ہے جو اصولاً تو شاہجہاں کے عہد حکومت کی تاریخ ہے لیکن دوسرے مورخین کی روش کے مطابق اس کے آخر میں فضلائے عہد کے تراجم کا بھی التزام کیا گیا ہے۔

عہد شاہجہانی کے پہلے دس سال کی تاریخ مرزا امینائے قزوینی نے لکھی تھی، اس کے بعد پہلے بیس سال کی تاریخ عبدالحمید لاہوری نے لکھی، اور مورخین نے بھی اس عہد کی تاریخیں لکھیں، بعد میں عہد شاہجہانی کے تیس سال کی تاریخ محمد صالح کنبوہ نے "عمل صالح" کے نام سے مرتب کی۔ "عمل صالح" ۱۰۷۰ھ میں مکمل ہوئی چنانچہ مصنف نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"در سال ہزار و ہفتاد ہجری از چمن آرائی ایں گلشن فیض فراغ یافتہ سر رشتہ باوج سپہر بینائی برافراختم"[۱]

اگرچہ بعد میں مصنف نے اس میں ۱۰۸۵ھ تک کے واقعات بڑھادئے مگر اصولاً

---

[۱] عمل صالح کنبوہ ص ۵،

یہ کتاب ۱۰۷۰ھ میں لکھی گئی، یعنی فاضل جونپوری کی سوانح حیات کے قدیم ترین ماخذ "شیر و شکر" کے کوئی چودہ[۱۴] سال بعد۔

عبد الحمید لاہوری نے جن وجوہ سے بھی ہو، ملا محمود جونپوری کو "بادشاہ نامہ" میں درخور ذکر واعتنا نہیں سمجھا، مگر محمد صالح نے اپنے پیشرو کے بخلاف ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے، اور اس طرح اس کوتاہی کی تلافی کر دی ہے جو اس باب میں عبد الحمید لاہوری سے ظہور میں آئی تھی اگرچہ زمانہ کی عام روش کے مطابق ان کا انداز نگارش بھی تزئین عبارت کا بڑا حسین وجمیل مرقع ہے مگر اس عبارت آرائی میں بھی بعض اوقات مختلف علماء وفضلاء کے متعلق بعض اہم تصریحات مل جاتی ہیں، جن سے ان کی شخصیتوں کے نکھار میں خاصی مدد مل سکتی ہے، جہاں تک فاضل جونپوری کا تعلق ہے یہ واقعات ان کی وفات کے آٹھ سال بعد ہی قلمبند ہوئے ہیں، ان کی صحت میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجایش نہیں،

محمد صالح کنبو نے ملا محمود جونپوری کے بارے میں لکھا ہے:۔

"سر دفتر علمائے خطۂ وجود ملا محمود"

کہ ضمیر پاکش معانی را مقام محمود است و سپہر فضل و دانش را کوکب مسعود۔ در شہر صفا پرور جونپور پذیرائی سرشت گردیدہ و از آغاز ایام شعور در ابداع بدایع محسنات سخن کوشیدہ۔ مظہر فضل سرمدی و منبع فیض ابدی بود۔ و در انواع فنون دانش خصوص علم معقول و منقول در ریاضی و طبیعی و الٰہی ہیچ کس از ارباب استعداد را قوت دعوی برابری باوے نبود۔ اگرچہ در خور دانش و بینش خود طلاقتِ زبان و تقریر لسان نداشت،

اما قلم فیض رقمش در حالت تحریر تفسیر آیات کلام الٰہی و تعبیر حقائق اشیاء کماہی بعنوان تصنع و تفنن بکار می برد کہ بر نقش کلکش دعوی فضیلت معنی پردازی آں جناب را زباں می دہد و سخنان ارجمندش بعلاقۂ عرائس معنی در صدر انجمن دلہائے والا فطرتاں اقامت انداز گشتہ۔ ہر لفظش کہ در اثبات شرافت لطائف نفی (؟) نطق ناطق و مخبرے صادق است، ابواب حیرت بر روئے روزگار می کشاید، (عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۸۳-۳۸۴)

اس تذکرے سے فاضل جونپوری کے متعلق چند نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

ملا صاحب "تفسیر و حدیث اور حکمت" کے علاوہ فن ریاضی میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے،

"و در انواع فنون دانش خصوص علم معقول و منقول و ریاضی و طبیعی و الٰہی ہیچ کس از ارباب استعداد را قوت دعوی برابرے باوے نبود۔"[۱]

محمد صالح کی اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم حکمیہ و فلسفیہ میں طبعیات و الٰہیات کے علاوہ ملا محمود کو ریاضیات میں بھی غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی، وہ ریاضیات کی شاخ "علم الہیئت" میں بھی ممتاز مقام رکھتے تھے، مگر غالباً ان کی تحقیق پسند طبیعت اس فن میں "اگلے جانے والوں کی تقلید" پر راضی نہیں ہو سکی، اس لئے جیسا کہ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے: "وہ بادشاہ کو رصد بندی کے لئے آمادہ کرنے کے لئے دہلی تشریف لے گئے مگر وزیر کی دور اندازی سے ان کی تجویز بروئے کار نہ آسکی۔"[۲] اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

اپنے پیشرووں (ترک و افغان سلاطین دہلی) کے برخلاف مغل تاجداروں کو نجوم و ہیئت سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ بابر کے اسلاف میں الغ بیگ تو اپنی رصد گاہ،

۱؎ عمل صالح جلد اول ص ۳۸۳، ۲؎ آزاد بلگرامی ماثر الکرام ص ۲۰۲،

سمرقند (جس کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں) اور "زیج سلطانی" کی تدوین و ترتیب کے لئے مشہور ہے، جو اسلامی علم الہیئت کی تاریخ میں آخری اہم ترین رصدگاہ اور زیج محسوب ہوتی ہیں۔ عبدالرزاق نے "مطلع السعدین" میں لکھا ہے:۔

مرزا الغ بیگ کہ در علوم و فنون صاحب نصیب اوفی و نصاب مستوفی بود...... با خواص حکما و فحول عقلا و مہندسان عطارد کا و فیلسوفان مجسطی کشا...... مثل...... قاضی زادہ رومی و...... مولانا علاء الدین علی قوشجی...... و مولانائے اعظم غیاث الدین جمشید کاشی و مولانائے معظم معین الدین...... انجمنے ساخت..... و بعد از تحصیل کمالات و تکمیل آلات میل انبساط رصد و استخراج زیج فرمود و در شمال سمرقند مائل بمشرق مقام لائق تعین نمود...... و بنائے آں..... استحکام یافت[1]۔

اس رصدگاہ کی علمی و ہئیتی تحقیقات نے خواجہ نصیر الدین طوسی کی رصدگاہ مراغہ کی دریافتوں اور ان کی مرتبہ "زیج ایلخانی" پر قابل قدر اضافے کئے، چنانچہ عبدالرزاق نے آگے چل کر لکھا ہے،

تقویم آفتاب و سائر کواکب را رصد کردہ بر زیج جدید ایلخانی کہ جناب حکمت مآب خواجہ نصیر الدین طوسی استخراج نمودہ بود، فوائد و لطائف افزود و در تقویم آفتاب و کواکب دیگر تفاوت صریح ظاہر ساخت[2]۔"

اس کا نتیجہ تھا کہ اس کے مقابلے میں پچھلی ہئیتی جدولیں اور زیچیں تقویم پارینہ بن گئیں اور بعد کے علمائے ہئیت کا نہ صرف عبدالرزاق کے زمانہ بلکہ رصدگاہ محمد شاہی اور زیج محمد شاہی کے زمانہ تک، اسی پر اعتماد کیا جاتا تھا، عبدالرزاق نے آخر میں لکھا ہے:۔

---

[1] عبدالرزاق: مطلع السعدین صفحہ ۲۲۷-۲۳۸۔ [2] مطلع السعدین صفحہ ۲۳۸،

"آں زیج تصحیح یافتہ باتمام رسید و بزیج سلطانی گورگانی موسوم شدہ و میان مہرۂ صناعت تنجیم و اصحاب تقادیم معمول و متداول است[1]۔"

اس تفصیل سے مغل تاجداروں کا ہئیت و نجوم کیساتھ غیر معمولی اعتنا واضح ہو گیا ہوگا۔ ہندوستان میں مغل حکومت کی بنیاد بابر نے ڈالی، وہ ہر چند کہ "السیف اصدق ام الانبا" کا قائل و عامل تھا، مگر لوازم دربار میں نجومی کا ہونا بھی داخل تھا اسلئے اس کے یہاں بھی محمد شریف نام کا منجم تھا اور اپنے خلاف طبیعت بادشاہ اُسے برداشت کرتا تھا، رانا سانگا کے ساتھ جنگ میں اگرچہ اس منجم نے بڑی ہمت شکن پیشین گوئیاں کی تھیں مگر فتح کے بعد جب دوسرے جان نثاروں کو دل کھول کر انعام و اکرام سے نوازا تو اس "شوم نفس منجم" کو بھی ایک لاکھ دے کر مغل دربار کی دیرینہ روایت کو برقرار رکھا، بابر اپنی خود نوشت سوانحعمری "بابرنامہ" میں لکھتا ہے:۔

(و بعد از فتح) محمد شریف منجم کہ چہ نوع نقشہائے شوم راندہ بود بمبارکباد فتح آمدہ او دشنام بسیاری دادہ دل خود را خالی کردم...... چوں قدامت خدمتی داشت یک لک انعام کردہ رخصت دادم کہ در قلمرو من نہ ایستد۔" (بابرنامہ صفحہ ۲۱۴)

اور ہمایوں تو گویا "تبحر فی علم الہیئت" کا مظہر ہی تھا[2] ابوالفضل اس کے بارے میں لکھتا ہے:۔

در اقسام علوم خاصہ ریاضی در زمان خود نظیر و سہیم نداشتند۔ (اکبرنامہ جلد اول ص ۱۳۲)

دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

---

[1] مطلع السعدین صفحہ ۲۳۹، [2] ابوالفضل اکبرنامہ جلد اول صفحہ ۱۲۰ میں اسکے تذکرہ کا آغاز صنعت براعۃ استہلال سے کرتا ہے جس میں علم ہئیت کی مصطلحات کو استعمال کیا ہے: "کرسی کرہ اسرار ابدی و ازلی، عضادہ اصطرلاب حکمت علمی و عملی"،

از اقسام علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام داشتند، علی الخصوص در اقسام علوم
ریاضی آنحضرت را پایہ بلند بود و جوادہ بار باب حکمت صحبت می داشتند
و ممتاز ان علم ریاضی در پایۂ سریر والا کامیاب سعادت بودند"[1]
(اکبر نامہ جلد اول صفحہ ۳۶۸)

یہاں تک کہ اسی شوق فضول میں اس کی موت واقع ہوئی، ابوالفضل نے اس کے آخری
دن کے پروگرام میں لکھا ہے:۔

آخر روز جمعہ ربیع الاول سنہ نہصد و شصت و سہ...... جمعے از ریاضی
دانان را طلب فرمودند، و آں شب مظنۂ طلوع زہرہ بود، می خواستند
کہ ملاحظہ فرمایند و نیت حق طویت آں بود کہ چوں زہرہ طالع شود و
ساعت مسعود گردد، مجلس عالی داشتہ جمعے را بمناصب عالیہ امتیاز بخشند"[1]

مگر شام کے وقت زینہ سے اتر رہا تھا کہ پیر پھسلا اور راہی ملک عدم ہوا۔

اکبر نے کچھ تو خاندانی روایات کا اثر اور کچھ الحاد و بیراہ روی کے تحت علوم
سنہ اولہ کو ترک کر کے علوم حکمیہ خصوصاً نجوم و حساب کی تعلیم و تعلّم کا حکم دیا۔

"حکم شد کہ الہیین از علوم غیر نجوم و حساب و طب و فلسفہ نخوانند و عمر گرامی
صرف آنچہ معقول نیست، صرف نکنند"[2]

جہانگیر بھی اپنی خوش باشی کے باوجود (جو علم و حکمت کی سرپرستی سے بے اعتنائی برتنے
کی مقتضی تھی)، نجوم کا معتقد تھا، اس کا درباری جوتشی جوتکرائے تھا جسے وہ نہایت فراخدلی
کے ساتھ نوازتا رہتا تھا، چنانچہ اس کے بارے میں اپنی عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے "تزک"

۱؎ اکبر نامہ جلد اول صفحہ ۳۶۳، ۲؎ ذوالفقار اردستانی، دبستان المذاہب صفحہ ۳۲۸،

میں لکھتا ہے:۔

"بسیارے از احکام او (جوتک رائے) مطابق افتادہ کہ خالی از غرابت
نیست، و دریں واقعات بتقریبات ثبت شدہ، بنا بریں فرمودند کہ او را
بزر کشیدند شش ہزار و پانصد روپیہ برآمد بانعام او مقرر گشت"
(تزک جہانگیری صفحہ ۳۲۹)

ان ہی اسلاف کا خلف الرشید شاہجہاں تھا، نجوم و ہیئت کے ساتھ اعتناء
اس نے اپنے آباء واجداد سے ورثہ میں پایا تھا، اور شاید اسی اعتناء مفرط کا نتیجہ تھا کہ اسکے
دوسرے سال جلوس (۱۰۳۹ھ=۱۶۲۹ء) میں ملا فرید منجم نے بادشاہ کے ایما، وزیر آصف جاہ
کے زیر اہتمام اور اپنے بھائی ملا طیب نیز ہیئت اور جوتش کے ہندوستانی اور یونانی
مکاتب کے ماہرین کی معاونت سے ایک نئی ہیئتی جدول بعنوان "زیج شاہجہانی" مرتب
کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور حوصلہ صد ہزار تحسین و آفریں ٹھہرا[1]، "طبقات
شاہجہانی" میں ملا فرید کے تذکرے میں مرقوم ہے:۔

"ملا فرید منجم علیہ الرحمہ از علم و دانش جزے تمام داشت و در جفر و وقف
اعداد و علم حساب و نجوم نظیر نداشتہ دیگانۂ آفاق بودہ...... و در آخر
عمر زیجے بنام حضرت بادشاہ دین پناہ ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب
قرآن ثانی نوشتہ و از فضائل و کمالات خود نمونہ گزاشتہ،، (طبقات شاہجہانی صفحہ ۵۳۱)

مگر زیادہ تفصیل محمد صالح کنبو نے دی ہے، اس نے "دو میں سال جلوس" کے حالات میں لکھا ہے:۔

"از سوانح ایں احیان سعادت بے پایان، ملا فرید منجم کہ در تحصیل فن

۱؎ عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۶۱،

ریاضی باوجود مناسبت طبعی و موافقت طالعی بتوفیق الٰہی ریاضت تمام
کشیدہ بود...... کتاب زیج شاہجہانی کہ از توجہ حضرت صاحبقرانی در اہتمام
دستور اعظم آصف جاہی بہمراہی برادر خود ملا طیب و سایر ریاضی دانان
روشن ہند و یونان باتمام رسانیدہ بود از نظر انور شاہنشاہ عالم دوم نیز
اعظم گذرانیدہ و حسن سعی او بحل تحسین و احسان و بتوقیع قبول و استحسان
وصول یافت۔“[۱]

اس کتاب کے آگے ”زیج الغ بیگ“ بھی ماند پڑ کر رہ گئی اور اہل علم نے جنتری تقویموں کی
تیاری میں اسی پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ کتاب کی افادیت اپنی جگہ، مگر اس علم سے
بادشاہ شاہجہاں کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ اس نے اس کتاب کے ہندی زبان میں ترجمہ
کرنے کا حکم صادر فرمایا، محمد صالح آگے چل کر لکھتا ہے:-

”چوں اصول و ابواب این کتاب حساب متضمن فوائد بے شمار و منافع
بے حساب بود..... چنانچہ بالفعل اہل این فن از زیج الغ بیگی مستغنی شدہ
استخراج تقادیم ازین کرامت نامہ نامی می نمایند حسب الامر اقدس
بقصد تعمیم نفع آں و سہولت تفہم و تفہیم و تعلم و تعلیم منجمان ہندی زبان
رصد بندان اقلیدس کشائے در جرپیمایان دقیقہ رس عبارت آنرا بلغت
ہندی ترجمہ نمودند“[۲]

بادشاہ کو ان امور سے اتنی دلچسپی تھی کہ دکن اور بلخ کی مسلسل جنگوں کے باوجو
وہ ان کے لئے وقت نکال لیا کرتا تھا، چنانچہ اس نے ۱۶ ویں سال جلوس (۱۰۵۲ھ)

[۱] عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۶۱، [۲] ایضاً ۳۶۲،

میں اوقات شبانہ روزی میں اصلاح کرائی جیسے محمد صالح نے اس سال کے واقعات میں
”قانون محدود گھڑیہائے شبانہ روزی“ کے عنوان سے لکھا ہے[۱] اس کی تفصیل حسب ذیل ہے
عام طور سے دن آفتاب کے طلوع سے اس کے غروب تک کے عرصہ زمانی کا نام ہو
اور رات غروب سے طلوع تک کے عرصہ کا، اور یہی نجومی روز و شب ہیں، مگر عملی زندگی
میں دن طلوع آفتاب سے کچھ پہلے شروع ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب کے کچھ دیر بعد تک
رہتا ہے، ان عملی ضرورتوں میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم فجر اور مغرب کی
نمازیں اور ان کے اوقات کا لحاظ ہے، لہٰذا ہندو ماہرین توقیت و علم الہیئت نے
ایسا مقرر کیا ہے کہ دن طلوع آفتاب سے ڈیڑھ گھڑی (۳۶ منٹ) قبل شروع ہو جاتا
ہے اور غروب کے آدھی گھڑی (۱۲ منٹ) بعد تک رہتا ہے[۲]

لیکن خود دن اور رات کی مقدار سال کے مختلف ایام میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔
مثلاً عہد شاہجہانی میں لاہور کا بڑے سے بڑا دن ۳۵ گھڑی کا ہوتا تھا اور چھوٹی سے چھوٹی رات
۲۵ گھڑی کی، اسی اصول پر صبح اور شام کے گجر بجائے جاتے تھے،

مگر شاہجہاں کی دینداری اور اسلام پسندی نے جو فجر اور مغرب کی نمازوں کو مسنون
اور مستحب اوقات میں ادا کرانے کی متقضی تھی اس ضابطہ متداولہ میں کچھ ترمیم کی۔ اور حکم
دیا کہ صبح اور شام کے گجر تو حسب دستور بجتے رہیں مگر دن اور رات کی گھڑیوں کے
پیمانوں کی تبدیل کر دی جائے اور ڈیڑھ گھڑی طلوع آفتاب سے قبل اور آدھی گھڑی
غروب آفتاب کے بعد جو اہل تنجیم (ہیئت دانوں) کے نزدیک رات میں داخل ہیں،
انھیں رات کی گھڑیوں سے کم کر کے دن کی گھڑیوں میں بڑھا دیا جائے، چنانچہ لاہور کا

[۱] عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۸۸، [۲] ایضاً جلد دوم صفحہ ۳۸۸،

طویل ترین دن ۲۷ گھڑی کا ہوگیا، اسی طرح دوسرے شہروں، آگرہ، دہلی، کشمیر، کابل اور دولت آباد (دیوگری) کے دن بھی بڑھ گئے، محمد صالح نے اس قانون کے تحت لکھا ہے۔

"چوں دریں وقت ضابطۂ مذکورہ بہ پیشگاہ خاطر صواب ناظر خاقان جہاں ...... پرتو افگند و تفاوت گھڑیہا بر فراز ظہور برآمد، از القائے ربانی و الہام آسمانی ضابطۂ دیگر کہ باعث ارتفاع تفاوت مقدار گھڑیہا و اختلاف پیمانہ موجب تشخیص وقت نماز فجر و مغرب بر وفق سنت سنیہ باشد بادشاہ دین پناہ مقرر فرمودند کہ وقت نواختن گجر صبح و شام را بدستوری کہ گذارش یافت بجال داشتہ پیمانۂ گھڑیہائے لیل و نہار مساوی المقدار گردانیدند و یک و نیم گھڑی پیش از طلوع آفتاب و نیم گھڑی بعد از غروب کہ نزد اہل تنجیم داخل شب است از عدد گھڑیہائے شب کم نمودہ بر گھڑیہائے روز افزودند، چنانچہ روز اطول اکبرآبادی سی و شش و شاہجہان آبادی سی و شش و نیم و دارالسلطنت لاہوری سی و ہفت گھڑی و کابلی سی و ہفت و نیم گھڑی و کشمیری سی و ہشت گھڑی و در بلدۂ دولت آبادی سی و پنج گھڑی قرار یافت۔" (عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۰۸)

ملا فرید نے "زیج شاہجہانی" مرتب کی تھی۔ مگر عملی طور پر ان کا اعتماد رصدگاہ الغ بیگ کے ہیئتی مشاہدات اور دریافتوں پر تھا، ضرورت ہمایوں کے زمانہ سے ایک نئی رصدگاہ قائم کرنے کی محسوس کی جارہی تھی، ابوالفضل نے بادشاہ ہمایوں کے بارے میں لکھا ہے :-

"آنحضرت را ارادہ بستن رصد مصمم بود و بسیارے از آلات رصدی ترتیب

دادہ بودند و چند جا محل رصد خیال فرمودہ بودند[۱]۔ مگر ابھی طلوع زہرہ کے منظر "ہی میں قلعہ کی چھت پر چڑھ رہا تھا کہ پیام اجل آگیا۔ ان کے جانشین اکبر کو ان علوم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور اگر امیر فتح اللہ شیرازی زندہ رہتے تو یہ منصوبہ عمل میں آجاتا، مگر ان کی موت (۹۹۷ھ) نے اسکے امکان کو معدوم کر دیا، امیر فتح اللہ کے شاگرد ملا حسن علی موصلی کے ساتھ استادی و شاگردی کا رشتہ ہونے کے باوجود ابوالفضل کا رویہ بڑا اہانت آمیز تھا[۲]، اس لئے انھوں نے اپنی عافیت ملک کے چھوڑنے ہی میں سمجھی اور رصدگاہ تعمیر نہ ہو سکی، مگر اس کی ضرورت کا احساس مغل تاجداروں میں باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملتا رہا، بادشاہ کی اسی رغبت کی بنا پر ملا محمود جونپوری دہلی تشریف لے گئے، اور بادشاہ کو قیام رصدگاہ پر آمادہ کر لیا مگر اسی زمانہ میں بلخ کی مہم کی تیاری زور شور پر تھی اسلئے وزیر کو بادشاہ کے اس علمی و حکمی کارنامہ کو انجام دینے سے باز رکھنے کا بہانہ ہاتھ آگیا[۳]۔

اب یا تو یہ حکمراں وقت کی ذاتی رغبت اور خاندانی میلانات کے زیر اثر "الناس علی دین ملوکہم" کے ہمہ گیر قانون کی کارفرمائی کا نتیجہ تھا یا پھر زمانہ کا مذاق و رجحان ہی اس بات کا مقتضی تھا کہ اس عہد کے اکثر و بیشتر علماء علوم متداولہ کے ساتھ ریاضی و ہیئت میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ان "اکثر و بیشتر" علماء میں ملا محمود جونپوری اور ملا فرید منجم کے علاوہ گل سرسبد ملا علاء الملک تونی تھے جنھوں نے اپنی غیر معمولی دانش و بینش، علم و فضل کاردانی و سلیقہ مندی سے عہد شاہجہانی ہی میں "منصب ارجمند خاں سامانی و خطاب فاضل خانی" حاصل کر لیا تھا، اور شاہجہاں کے جانشین عالمگیر اورنگ زیب کے عہد میں "بپایہ وزارت کل ہندوستان" اور منصب پنج ہزاری تک پہونچے محمد صالح نے ان کے علمی تبحر بالخصوص

---

۱ اکبرنامہ جلد اول صفحہ ۳۶۸، ۲ منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۱۳۶، ۳ مآثر الکرام صفحہ ۲۰۲

ریاضی وہیئت میں ان کی دستگاہ کے بارے میں لکھا ہے:۔

"در فنون حکمت مہارتے تمام داشت...... در حساب وجبر و مقابلہ ہیچ یکے با او یارائے مقابلہ نداشت و در ہیئت و ہندسہ کسے را با او نیروئے مقابلہ نبود و در فنون دانش و بینش مرتبۂ معلم ثالث بل رتبۂ عقل اول بہم رسانیدہ"

(عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۸۰)

علی مردان خاں نے خزانۂ عامرہ کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی دریائے راوی سے نہر نکالنے میں کامیابی حاصل نہیں کی، مگر علاء الملک نے اس کے نقائص کی اصلاح کر دی، محمد صالح نے لکھا ہے،

"حسب الحکم اشرف جامع کمالات صوری و معنوی ملا علاء الملک تونی کہ از آب تراز و علوم غریبہ وقوف تمام دارد تا پنج کروہ نہر آوردۂ علی مردان خاں را بجال داشتہ سعی ودو کردہ راہ نمو بر نمودہ آب وآخر آورد چنانچہ از سال شانزدہم جلوس تا حال کہ سال بیستم است آب واخمہ بے فتور بباغ می رسد" (عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۱۲)

ملا علاء الملک کو صناعت تنجیم میں خصوصیت سے مہارت تامہ حاصل تھی، محمد صالح لکھتے ہیں:۔

"جامع فضائل صوری و معنوی ملا علاء الملک تونی میر سامان کہ در صناعت تنجیم صاحب خبرۂ و مہارت کلی بودہ و در دقائق این فن ذو فنون درجہ علیا و ید طولیٰ داشتہ" (ایضاً صفحہ ۴۹۲)

مگر اسی مہارت کے باوجود علاء الملک ہوں یا فرید منجم رصد بندی کی جرأت

کسی فاضل کو نہ ہوئی، اور ہوئی تو ملا محمود جونپوری کو ہوئی، مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

دزیر کی دراندازی نے ساری تجویز چوپٹ کر دی[1]، ورنہ شاید رصد گاہ مراغہ اور رصد گاہ سمرقند سے بھی عظیم الشان رصد گاہ ہندوستان میں قائم ہو جاتی، اور رصد گاہ محمد شاہی کی ضرورت باقی نہ رہتی۔

مگر فلسفہ "ماقبل الطبیعیات و مابعد الطبیعیات" کے مسائل کی شرح و ایضاح میں غیر معمولی مشغولیت کی بنا پر اس عبقری روزگار کی ہیئتی صلاحیتیں منظر عام پر نہ آسکیں یوں بھی "شمس بازغہ" کی شہرت نے ان کی دیگر بلند پایہ تصانیف کو گوشۂ گمنامی میں ڈال دیا چنانچہ آزاد بلگرامی نے ان کی صرف دو ہی کتابوں کا ذکر کیا ہے:۔

"شمس بازغہ در حکمت و فرائد در فن بلاغت" اگرچہ یہ بھی فرماتے ہیں: "کمیت قلم در میدان تصنیف جولان دارد"[2]

ظاہر ہے کہ ان کے "کمیت قلم کی جولانی کا میدان تصنیف" صرف دو کتابوں میں محدود نہ ہوگا، اسی لئے مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے فاضل جونپوری کے ترجمہ میں لکھا ہے:۔

"ومن تصانیفہ مالم یطلع آزاد: الدوحۃ المیادۃ فی الصورۃ والمادۃ ورسالۃ فی الکلی والجزئی ورسالۃ فی تحقیق اجتماع النقیضین وارتفاعہما ورسالۃ فارسیہ فی تحقیق القضاء والقدر ورسالۃ فی وحدۃ

انکی وہ تصانیف جن سے آزاد بلگرامی واقف نہیں تھے حسب ذیل ہیں:۔ الدوحۃ المیادۃ فی الصورۃ والمادۃ، رسالہ فی الکلی والجزئی، رسالہ فی تحقیق اجتماع النقیضین وارتفاعہما، فارسی رسالہ در تحقیق قضاء و قدر، رسالہ

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۰۲، [2] ایضاً،

الوجود وغیر ذلک ایضاً فی وحدۃ الوجود، وغیرہ۔

اس "وغیر ذلک" سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ فہرست بھی مکمل نہیں ہے، اور
اس کی کچھ اور کتابیں بھی ہیں، جو شمس بازغہ، کی وجہ سے شہرت نہ پاسکیں، ممکن ہے انہیں
ریاضی وہیئت کے بھی کچھ رسائل ہوں، لیکن جب تک یہ "رسائل" سامنے نہیں آتے
نہ تو ان کے موضوع کے متعلق کچھ کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی بنیاد پر ان کی ریاضیاتی
وہیئتی صلاحیتوں پر کوئی تبصرہ کیا جاسکتا ہے،

پھر بھی "شمس بازغہ" میں ان کے جستہ جستہ افادات سے اس فن کے اندر ان کی
بالغ النظری کا اندازہ ہو سکتا ہے،

مثلاً کائنات کی تشکیل (ہیئت افلاک وکواکب) اور اجرام سماوی کی گردش
وحرکت کا مسئلہ قدیم علم الہیئت کا ایک مہتم بالشان موضوع تھا، لیکن جس نہج سے
ملا محمود جونپوری نے "شمس بازغہ" میں اس کی توضیح کی ہے وہ ایک انفرادی شان
رکھتا ہے، کم از کم علم الہیئت کی متداول کتابوں میں یہ انداز توضیح نہیں ملتا۔

آجکل عربی مدارس کے نصاب میں علم ہیئت کی دو کتابیں داخل درس ہیں، امام
الدین ریاضی کی "التصریح فی الہیئۃ" اور قاضی زادہ رومی کی "شرح چغمینی" اوّل
الذکر شیخ بہار الدین عاملی کے ایک متن متین "تشریح الافلاک" کی شرح ہے، شارح
امام الدین ریاضی فاضل جونپوری سے بہت زیادہ متاخر ہیں، اس لئے مؤخر الذکر
کے زمانہ میں "تصریح" کے رواج کا سوال ہی نہیں ہوتا، البتہ ماتن شیخ بہار الدین
عاملی، جو میر باقر داماد کے ہم عصر تھے، ملا محمود جونپوری کے معاصر متقدم تھے، صاحب

لہ شمس بازغہ ص ۱۰۰، مطبوعہ جید برقی پریس دہلی ۱۳۵۴ھ،

"طبقات شاہجہانی" نے انھیں عہد جہانگیر کے علماء میں محسوب کیا ہے۔ غالباً ان کا
رسالہ "تشریح الافلاک" جلد ہی ایران کے علاوہ ہندوستان میں بھی مقبول ہوگیا، اور
۱۰۸۵ھ میں ملا عصمت اللہ سہارنپوری نے "باب تشریح الافلاک" کے نام سے اس کی
شرح لکھی جو آج سے کوئی نصف صدی پیشتر تک عربی مدارس میں "تصریح" و "شرح چغمینی"
کے علاوہ لائق اعتنا سمجھی جاتی تھی، اگر یہ کتاب فاضل جونپوری کی وفات کے بعد تصنیف
ہوئی، لہذا اس کے بھی ان کے پیش نظر ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، البتہ اس کا متن
ان کے زمانہ میں تصنیف ہو چکا تھا، اور شاید ہندوستان میں متعارف بھی ہوگیا
ہوگا، مگر حریفانہ چشمک کی بنا پر ان کی نظر میں اس کے درخور اعتنا ہونے کا امکان
نہین ہے،

شرح چغمینی کا متن ساتویں صدی ہجری کے ایک فاضل وقت محمود بن محمد بن عمر
الجغمینی کی تصنیف ہے، "شرح چغمینی" بجائے خود ایک عظیم ریاضی داں و ماہر علم الہیئت
قاضی زادہ رومی کی تصنیف ہے جو اپنے استاد میر سید شریف کو بھی خاطر میں نہیں لاتے
تھے، اور غیاث الدین جمشید کاشی کی وفات کے بعد رصدگاہ الغ بیگ کے منتظم اعلیٰ رہے تھے،
مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو گیارہویں صدی ہجری کے نصف اول میں کم از کم پورب
میں اس کتاب کا رواج نہ تھا یا ملا محمود ہی نے اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا، "شمس بازغہ"
سے تو ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے اس میں جن کتابوں کا اہتمام سے ذکر کیا ہے
وہ ہیں: "شروح تذکرہ" اور "کتاب المجسطی"۔

اول الذکر کا حوالہ انھوں نے "افلاک جزئیہ" کی تعداد کے سلسلے میں دیا ہے مگر
اس کی تصریح سے پیشتر بطلیموسی نظام ہیئت پر بالخصوص جس طرح وہ متاخر مسلمان

ہیئت دانوں میں سمجھا جاتا تھا، ایک طائرانہ نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا، اس کے لئے ہمیں آج کل ہی کی متداول ہیئت کی درسی کتابوں کو پیش نظر رکھنا ہے،

قاضی زادہ رومی نے ماتن (بلکہ جمہور ماہرین علم الہیئت و فلکیات) کے اتباع میں بتایا ہے کہ مرکز عالم میں کرۂ زمین واقع ہے، اس پر کرہ آب، اسی پر کرہ ہوا، اور کرہ ہوا پر کرہ نار محیط ہے، کرۂ نار کو فلک قمر احاطہ کئے ہوئے ہے، اسے فلک عطارد، اس پر فلک زہرہ، اس پر فلک شمس، اسے فلک مریخ، اسے فلک مشتری اور اسے فلک زحل محیط ہے، فلک زحل پر کواکب ثابتہ کا کرہ ہے اور سب کے آخر میں فلک اطلس ہے، اس طرح فلک قمر کے جوف میں عناصر اربعہ کے کرات ہیں اور کرہ نار کے اوپر افلاک نہگانہ تو بتو متلاصق انداز میں محیط ہیں۔

اس ضمن میں دو باتیں: ان افلاک کی تعداد اور ان کی ترتیب قابل غور ہیں، سوال یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کی دلیل کیا ہے۔

افلاک کلیہ کی تعداد کے بارے میں قاضی زادہ رومی نے لکھا ہے:۔

"والوجہ فی کونہا تسعۃ انہم وجدوا تسعۃ حرکات متخالفۃ فاثبتوا لکل منہا فلکا فی بادی نظرہم لا انہم وجدوا فی بادی النظر تسع حرکات مختلفۃ فاثبتوا تسع افلاک اذ فی وجدان حرکۃ الثوابت فی بادی النظر نظر"۔	آسمانوں کے نو ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین علم الہیئت نے (انکے اندر) نو باہمد گر مختلف حرکتیں پائیں لہذا بادی النظر میں ہر ایک کے لئے ایک مستقل فلک ثابت کیا، یہ وجہ نہیں تھی کہ انھوں نے بادی النظر میں نو مختلف حرکتیں پائی ہوں اور اس بنیاد پر نو افلاک ثابت کئے ہوں کیونکہ بادی النظر میں ثوابت کے اندر کسی حرکت کا پایا جانا محل کلام اور مختلف فیہ مسئلہ ہے۔
(شرح چغمینی صفحہ ۲۲)	

ملا محمود کے معاصر مقدم شیخ بہاء الدین عاملی نے عام ہیئت دانوں کا نظریہ لکھ دیا ہے کہ

"العالم الجسمانی کرۃ منضدۃ من ثلث عشرۃ کرۃ متلاصقۃ اعلاہا الفلک الاطلس وہو کاسمہ غیر مکوکب ثم فلک الثوابت وکلہا مرکوزۃ فی ثخنہ بحیث یماس سطح اعظمہا سطحیہ المحدب والمقعر ثم السموات السبع للسیارات السبع المشہورۃ"۔	عالم جسمانی کرہ ہی الہیئت ہے جو ایک تیرہ سے ملاصق (چپکے ہوئے) تیرہ کروں سے مرتب ہوا ہے، انہیں سب سے اوپر فلک اطلس ہے جو اپنے نام کی طرح ستاروں سے خالی ہے، پھر فلک ثوابت ہے، اور جملہ کواکب ثابتہ اس کے ثخن میں اسطرح جڑے ہوئے ہیں کہ انہیں سے عظیم ترین ستارے کی سطح اس کی (فلک ثوابت کی) سطح محدب اور سطح مقعر دونوں کی مماس ہوتی ہے، پھر سات آسمان ہیں جو مشہور سیارات ہفتگانہ کے واسطے ہیں۔
(التصریح فی الہیئۃ ص ۴-۶)	

متاخرین میں امام الدین ریاضی نے لکھا ہے:۔

"(ہذا) جار علی مذاق الحکماء القائلین بالتسع ولیس لہم علی ذلک برہان"۔	(یہ بات) ان حکماء کے مذاق کے مطابق ہے جو نو افلاک کے قائل ہیں مگر اس خیال کے واسطے ان کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں ہے،
(التصریح ص ۶)	

اس "مذاق حکماء" کی تقلید میں عوام کے اندر بھی آسمانوں کی تعداد نو ہی قرار پائی اور اس بات نے جلد ہی ایک حقیقت مسلّمہ کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ ظہیر فاریابی اپنے ممدوح قزل ارسلان کی تعریف میں لکھتا ہے:۔

نُہ کرسیِ فلک نہد اندیشہ زیر پائے تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلاں دہد

اور ظہیر کی اس مبالغہ آرائی پر طنز کرتے ہوئے شیخ سعدی فرماتے ہیں:۔

چہ حاجت کہ نُہ کرسیِ آسماں نہی زیر پائے قزل ارسلاں

ان تصریحات کے مقابلے میں ملا محمود کی توجیہ ہے، انھوں نے پہلے تو ایک عام فلکیاتی مشاہدہ کی دعوت دی ہے:۔

"واعلم ان ہذہ الاجرام النیرۃ لاسیما الثابتۃ نجدہا فی بادی الرائے متحرکۃ من المشرق نحو المغرب بحرکۃ سریعۃ جداً یتم الدورۃ فی قریب من یوم بلیلۃ ثم نجد السیارات بقلیل من التحدیق مختلفا عن ہذہ الحرکۃ باقدار متخالفۃ فیما بینہا فیکون لکل منہا فلک غیر الفلک المتحرک بالسریعۃ"

جاننا چاہئے کہ یہ روشن و درخشاں اجرام بالخصوص وہ جو ثوابت کے نام سے موسوم ہیں ہم انھیں بادی النظر میں مشرق سے مغرب کی جانب بڑی تیزی سے حرکت کرتے ہوئے پاتے ہیں اور اُنکا دور تقریباً ایک دن رات میں مکمل ہو جاتا ہے، پھر ہم ذرا غائر نظر سے دیکھنے کے بعد کواکب سیارہ کو بھی مذکور الصدر حرکت سے مختلف اور پچھڑا ہوا پاتے ہیں اور یہ اختلافات بھی آپس میں مختلف ہوتے ہیں۔ پس ان میں سے ہر ایک حرکت کیلئے لامحالہ ایک مستقل فلک ہوگا جو اس فلک سے بالکل مغائر اور جدا ہوگا جو انتہائی تیز حرکت (حرکت یومیہ) سے چکر لگاتا ہے۔

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

پھر ان متخالفۃ المقدار حرکتوں کی توجیہ کے لئے دو نظریے پیش کئے ہیں:۔

"فاما ان یکون افلاکہا ایضاً متحرکۃ من المشرق الی المغرب من غیر ان یتحرک بالحرکۃ الاولی بل بحرکۃ ناقصۃ فی السرعۃ منہا بقدر ما یتخلف عنہا کما توہمہ بعض الاوائل وجرٰی علیہ بعض المنتمین الی الحکمۃ فی الاسلام او ان تکون متحرکۃ من المغرب نحو المشرق مع تحرکہا بالعرض بالحرکۃ الاولٰی فیکون المحسوس من التخلف ہو فضل الاولٰی علی ہذہ الحرکات"

اب یا تو ان کے (ان حرکات سے وابستہ) افلاک بھی مشرق سے مغرب کی جانب حرکت کرتے ہوں بغیر اس بات کے حرکت اولٰی کے ساتھ متحرک ہوں بلکہ ایک کمتر سریع حرکت کیساتھ جو اپنی تیزی میں کچھ ناقص ہو اور اسکی مقدار اس کمی کے برابر ہوتی ہے جتنا کہ وہ اس (حرکت اولٰی) سے پیچھے رہ جاتے ہیں جیسا کہ بعض قدما، فلکیین کا خیال تھا یا جیسا کہ عہد اسلام میں بعض ایسے لوگوں کا خیال تھا جو اپنی حکمت و دانائی کیطرف نسبت کرتے تھے یا پھر مغرب سے مشرق کی جانب حرکت کرتے ہوں معہذا حرکت اولٰی کے ساتھ بھی گردش کرتے ہوں۔ لہذا ان کے حرکت اولٰی سے پیچھے رہ جانے کی مقدار اتنی محسوس ہوتی ہو جو حرکت اولٰی اور ان (کواکب سیارہ) کی حرکات کے فرق کے برابر ہو۔

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

اس کے بعد ان دونوں نظریوں پر تنقید کی ہے اور خالی از سقم نظریہ کو متعین کیا ہے۔

"والاول باطل والالحفظ کل منہا مطلعاً" اس میں سے پہلی شق باطل ہے ورنہ ہر سیارہ

واحداً ومغرباً كذلك ولم يختلف غاية ارتفاع كل في الفصول والايام فتعين الثاني"۔
(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

کی جائے طلوع ایک ہی رہتی اور اسی طرح جائے غروب بھی ایک ہی رہتی اور مختلف فصلوں یا دنوں میں ہر ایک سیارے کی غایت ارتفاع نہ بدلا کرتی۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ ان کواکب سیارہ کی حرکت فلک الکل کی حرکت سے مختلف جہات میں ہو فرماتے ہیں:-

"ویکون ہذہ الحرکات علی مناطق واقطاب غیر منطقۃ الاولی وقطبیہا"
(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

اور سیاروں کی یہ حرکتیں ایسے مناطق اور قطبوں پر ہوتی ہیں جو حرکت اولی کے منطقہ اور اس کے قطبوں سے مختلف ہیں۔

لیکن اس طرح آٹھ آسمانوں کے ثبوت کی گنجائش نکلتی ہے، حالانکہ حکما، کے مذاق کے مطابق ان کی تعداد نو[9] ہے، اس لئے وہ ایک دقیق تر مشاہدہ کی دعوت دیتے ہیں جو کواکب ثابتہ کی حرکت کا مثبت ہے:-

"ثم انہم وجدوا الثوابت بدقیق النظر تتخلف فی مدۃ طویلۃ قدراً یسیراً جداً عما یقتضیہ الحرکۃ الاولی ولم یحفظ ابعادہا بالنسبۃ الی منطقتہا وقطبیہا لکنہا لا تتخالف فیما بینہا۔ فاثبتوا لہا ایضاً فلکاً آخر یتحرک من المغرب الی المشرق بمثل ما مر فی السیارات فثبت تسعۃ افلاک: واحد منہا یتحرک

بالحرکۃ الاولی من المشرق الی المغرب ویحرک الکل وبالحری ان یکون محیطاً بالکل ومحدداً للجہات حافظاً بحرکتہ السریعۃ جداً للزمان، وثمانیۃ متحرک من المغرب الی المشرق: واحداً منہا للثوابت وسبعۃ للسیارات السبع"
(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

پھر جب انھوں نے بنظر دقیق دیکھا تو معلوم کیا کہ کواکب ثابتہ بھی مدت طویل کے بعد اس حرکت کے مقابلہ میں جو حرکت اولی کا تقاضا ہے کچھ تھوڑے سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور اس کے منطقہ اور قطبوں کے لحاظ سے اپنی دوری کو برقرار نہیں رکھ پاتے لیکن باہم آپس میں ایک دوسرے سے نہیں بچھڑتے، (ان کا باہمی فاصلہ غیر متبدل رہتا ہے) تو انھوں نے (قدیم ہیئت دانوں نے) ان (کواکب ثابتہ) کے لئے ایک مستقل فلک ثابت کیا جو مغرب سے مشرق کی طرف گردش کرتا ہے جیسا کہ کواکب سیارہ کے سلسلے میں اوپر گذرا۔ اس طرح نو آسمان ثابت ہوئے، ان میں سے ایک حرکت اولیٰ کے ساتھ مشرق سے مغرب کی جانب چکر لگاتا ہے اور جملہ (افلاک) کو حرکت دیتا ہے، لہذا چاہیئے کہ وہ سب کو محیط ہو، محدد جہات ہو، نیز اپنی سریع حرکت سے زمانہ کا حافظ ہو اور آٹھ افلاک مغرب سے مشرق کی طرف گردش کرتے ہیں۔

غرض افلاک کلیہ کی تعداد جمہور فلاسفہ ومنجمین کے نزدیک نو[9] ہے۔ لیکن مسلمان ماہرین علم الہیئت وفلکیات میں ایسی شخصیتوں کی کمی نہیں تھی جو اپنے یونانی پیشرووں کی آنکھ بند کرکے تقلید کرنا نہیں چاہتے تھے انھوں نے کہا کہ ہیئتی حسابات (Astronomical calculations) کے لئے نویں آسمان کے فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ افلاک نہگانہ کے نظریات پر کوئی ناقابل تردید حسی دلیل تو قائم ہے نہیں، صرف حرکات تسعہ کے تخالف کی بنا پر یہ نظریہ وضع کیا گیا تھا، لیکن حرکات تسعہ کے تخالف کی توجیہ

اس نظریہ کے علاوہ اور مفروضات سے بھی ہو سکتی ہے، چنانچہ تیسری صدی ہجری کے وسط میں بنو موسیٰ نے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور نویں آسمان کے وجود سے انکار کیا۔ ابن القفطی نے ان کی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے جس کا عنوان

"کتاب فی انکار ان ثم کرۃ تاسعۃ الافلاک" [۱]

ہے۔ اس کتاب کے اندر انھوں نے اپنے اختلاف کی توجیہ طبیعیاتی و مابعد الطبیعیاتی اصولوں پر نہیں کی، بلکہ ریاضی و ہندسہ کی مدد سے اپنے موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی چنانچہ ابن الندیم اسی کتاب کا نام وضاحت کے ساتھ؛

"کتاب بین فیہ بطریق تعلیمی و مذہب ہندسی اندلیس فی خارج کرۃ الکواکب الثابتۃ کرۃ تاسعۃ" [۲]

بتاتا ہے یعنی فلک البروج یا فلک الثوابت (آٹھویں آسمان) کے اوپر نواں آسمان نہیں ہے، اس کا ثبوت بذریعہ ریاضی و ہندسہ۔ (باقی)

---

[۱] ابن القفطی تاریخ الحکماء ص ۳۱۶ [۲] ابن الندیم کتاب الفہرست ص ۲۷۹،

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۹)

باجہ اور قربانی کا جھگڑا متحدہ قومیت پر نظری و فکری بحث تو اوپر کے حلقوں میں جاری تھی، لیکن عملی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں مسجد کے سامنے باجہ اور بقرعید کے موقع پر گائے کی قربانی پر روز بروز اختلاف بڑھتا جا رہا تھا، ہر قسم کی مصالحانہ کوشش بے سود ہو رہی تھی، مولانا محمد علی بھی اپنی وطن پروری کے جذبہ میں اس کے لئے کوشاں رہے، ۲۵ر نومبر ۱۹۳۰ء کے اخبار ہمدرد میں انھوں نے یہ مشورہ دیا،

"ہندو آزاد ہوں کہ جس وقت چاہیں اور جتنا چاہیں مسجد کے سامنے ڈھول اور تاشے بجایا کریں اور سنکھ اور قرنا پھونکا کریں، ساتھ ہی ساتھ مسلمان بھی آزاد ہوں کہ جتنی گائیں جس طرح بجا کر جس سڑک سے جہاں چاہیں لیجائیں، اور ان کا گوشت چاہے ڈھکا لیجائیں چاہے کھلا لیجائیں، کوئی کسی کا مزاحم نہ ہو، چند دنوں میں دونوں بیٹھ ایک دوسرے کی ضد پر اپنے مذہبی فرائض کا ادا کرنا خود چھوڑ دیں گے، اور شرافت اور بھل منسی کی طرف عود کر کے حقیقی رواداری کو اپنا شعار بنالیں گے، اس سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ آج دونوں طرف سے ضد کا مظاہرہ ہو رہا ہے، اور خواہ مخواہ مذہب کو اس میں گھسیٹا جا رہا ہے، ہندو مسلمانوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں، اور مسلمان ہندوؤں کو، حکومت اس تماشہ کو دیکھ رہی ہے، اور خود آج کسی سے مرعوب نہیں، اور دونوں کو مرعوب کئے ہوئے ہے، یہ ایک سیاسی جنگ ہے، میں نہ اس کو گوارا کر سکتا ہوں کہ مسلمان ہندوؤں سے مرعوب ہو جائیں، نہ اسکو پسند کر سکتا ہوں کہ ہندو مظلوم ہوں"۔

ہندو مسلمانوں کے تعلقات کی پچھلی اور اگلی تاریخ کے مطالعہ کے بعد دکھ ہوتا ہے کہ اختلاف کہاں سے شروع

اور کہاں جاکر ختم ہوا، اس زمانہ میں عام خیال رہا کہ انگریز یہ جھگڑے اپنے مفاد کی خاطر کھڑا کر کے اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اب انگریز ہندوستان سے جا چکے ہیں، لیکن اس قسم کے جھگڑے اب بھی برابر ہوا کرتے ہیں، محض اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حقیقی رواداری کو اپنا شعار نہیں بنایا ہے، جس کی تمنا مولانا محمد علی کرتے رہے، لیکن اس کا محض داغ لے کر اللہ کو پیارے ہوئے،

سوامی شردھانند کا قتل

۲۶ء کے دسمبر کی آخری تاریخوں میں آریہ سماج کے مشہور لیڈر سوامی شردھانند کو ایک پنجابی قاضی عبد الرشید نامی نے قتل کر ڈالا، سوامی جی شدھی تحریک میں بہت آگے آگے تھے، جس سے عام مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی، جس کے بعد ایک صاحب نے ان پر ہاتھ صاف ہی کر دیا، ہندوؤں کو اس سے بڑا دکھ پہنچا، پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی خود نوشت سوانحعمری میں اسکا ذکر اس طرح کیا ہے،

"۱۹۲۰ء کے آخر میں ایک بڑا اندوہناک حادثہ پیش آیا، جس نے سارے ہندوستان میں ہلچل ڈال دی اس سے روشن ہوگیا کہ فرقہ پرستی کے جوش میں ہم کتنی ذلیل سے ذلیل حرکت کر سکتے ہیں، سوامی شردھانند بستر علالت پر پڑے تھے، اور ایسی حالت میں ایک مذہبی دیوانے نے انھیں قتل کر دیا ایسے شخص کی جو گورکھوں کے برچھوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا تھا اور گولیوں کی بوچھار میں بڑھتا چلا گیا ایسی موت نصیب ہونی تھی، ابھی آٹھ سال پہلے آریہ سماجیوں کے اسی لیڈر نے جامع مسجد دہلی کے منبر پر کھڑے ہو کر ہندو مسلمانوں کے زبردست مجمع کو اتحاد اور آزادی وطن کا پیغام سنایا تھا، اور پورے مجمع نے ہندو مسلمان کی جے کے فلک شگاف نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا تھا، باہر سڑکوں پر ایک دوسرے کے دوش بدوش اپنا خون بہا کر اس نعرے پر مہر توثیق لگا دی تھی، آج وہ خود اپنے ایک ہم وطن کے ہاتھوں مارا گیا، جو یقیناً یہ سمجھتا ہوگا کہ یہ ثواب کا کام ہے، اور اس کی بدولت جنت میں جائیگا، میں ہمیشہ سے جسمانی دلیری کا معترف

رہا ہوں، اس دلیری کا جس کی بدولت انسان ایک اعلیٰ مقصد کے لئے مرتے دم تک جسمانی مصیبتیں برداشت کرتا ہے میرے خیال میں اور لوگ بھی اس کی اتنی ہی قدر کرتے ہیں، سوامی شردھانند میں یہ دلیری انتہا کو پہنچ گئی تھی، ان کا لانبا قد، گیروے کپڑوں میں لپٹا ہوا شاندار جسم، بڑھاپے کے باوجود تن کر چلنا، آنکھوں سے شرارے نکلنا، دوسروں کی کمزوری دیکھ کر تیوری پر بل آجانا؟ یہ تصویر میری آنکھوں میں پھر رہی ہے، اور دل پر نقش ہے"، (جلد اول ص ۲۶-۲۷)

اس سانحہ کے بعد مسلمانوں کو خوف رہا کہ اس جان کا بدلہ مسلمانوں کے کسی لیڈر کی جان سے لیا جائیگا، اور مولانا محمد علی کی جان کا خطرہ لاحق ہوگیا، لیکن وہ محفوظ رہے،

خواجہ حسن نظامی سے صحافتی جنگ

اسی زمانہ میں مولانا محمد علی ایک ایسی صحافتی جنگ پر اتر آئے، جس سے ان کی سرگرمیاں خواہ مخواہ زائل ہوئیں، یہ جنگ خواجہ حسن نظامی سے تھی، خواجہ حسن نظامی کا ایک خط مورخہ ۲ اگست ۱۹۱۸ء مل گیا جسمیں انھوں نے ہارٹ کے ضیاء الحق صاحب کو لکھا کہ میں نے نظام حیدرآباد کو پان اسلامزم کے جو سبق دیئے جاتے تھے، اس کی باضابطہ اطلاع دہلی کے چیف کمشنر کو دیدی ہے، مولانا محمد علی کو دکھ ہوا، کہ خواجہ صاحب نے اس طرح ایک مسلمان فرمانروا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی، انھوں نے یہ خط اپنے اخبار ہمدرد میں شائع کر دیا، پھر تو دونوں طرف سے ایسی جنگ ہوئی کہ تمسخر و استہزار کا کوئی دقیقہ باقی نہ رہا، مولانا محمد علی سیاسی لیڈر ہونے کے باوجود آج کل کے لیڈروں کی طرح ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور ہونے کے فن سے واقف نہ تھے، جو کچھ ان کے دل میں ہوتا، وہی ان کی زبان پر بھی ہوتا، حق و صداقت کے لئے ان کی نیام سے تلوار ہمیشہ نکل پڑتی، اور وہ نتیجہ سے بے خبر ہو کر اس کو چلاتے رہتے،

مجاہدین ریف کیلئے دعائیں

اسی زمانہ میں یورپ میں تھوڑے دنوں کے لئے اس وقت بڑی سیاسی اور حربی ہلچل مچ گئی، جب ریف کے مجاہد غازی عبد الکریم کی قیادت میں اسپین اور فرانس

سے ٹکر لینے لگے، ان کو کچھ جنگی کامیابیاں بھی حاصل ہونے لگیں، اس سے تمام دنیا کے مسلمانوں کی نظریں ان کی طرف اٹھنے لگیں، مولانا محمد علی کا اسلامی اور ملی جذبہ بھی اس سلسلہ میں ابھرا، چنانچہ جامع مسجد دہلی میں ایک جمعہ کو انھوں نے ان سرفروشوں کے لئے بہت ہی خضوع و خشوع سے بہت دیر تک دعائیں مانگیں، اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں،

"خداوندا! یہ مٹھی بھر آدمی جو بے سر و سامانی مگر تیری نصرت فرمائیوں کے ساز و سامان کے ساتھ اسپین اور فرانس جیسی طاقتوں اور حکومتوں سے نبرد آزما ہیں تاکہ اسلام کا علم مغرب اقصیٰ کی سرزمین پر سرنگوں نہ ہونے پائے، اپنے خزانۂ غیب سے ان کی مدد فرما، کیونکہ بغیر تیری نصرت بخشی و نصرت فرمائی کے یہ بے سر و سامان مجاہد ایسی عظیم الشان سلطنتوں کا کامیاب مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں، جو اپنی شیطانی طاقت کے نشہ میں سرشار ہیں اور جن کو اپنے آہنی آلات پر اس قدر گھمنڈ ہے کہ جہاں کہیں حق و صداقت کی روشنی نظر آتی ہے، چڑھ دوڑتے ہیں کہ اسکو گل کر دیں اور اپنی سطوت و جبروت کا سکہ بٹھائیں، اور جو اپنی ابلیسی قوت پر اس قدر مغرور ہیں کہ جس جگہ بھی کوئی کمزور اور ناتوان قوم بستی ہے یہ اس پر دھاوا بول دیتے ہیں، کہ جن گردنوں کو تو نے آزاد پیدا کیا ہے، اُن میں اپنی غلامی کا طوق لعنت ڈال دیں، اور جن سروں اور پیشانیوں کو تو نے صرف اپنی بارگاہ کبریائی میں رگڑنے کے لئے بنایا ہے، ان کو اپنی ناپاک چوکھٹوں پر رگڑوائیں، اے خدائے بے نیاز، اے وہ کہ تو نے اپنی قدرت کاملہ سے کمزوروں اور ناتوانوں کو طاقت و توانائی عطا فرما کر سرکش اور متمرد انسانوں کو شکست و ہزیمت کی ذلت و رسوائی دلوائی ہے، تیرے یہ ریفی بندے، جو بے سر و سامانی کے سوا کوئی ساز و سامان نہیں رکھتے بغیر تیری مدد کے فرانس و اسپین کے فراعنہ سے کس طرح سر بر ہو سکتے ہیں۔"

(ہمدرد ۲۲ جنوری ۱۹۲۶ء)

اس دعا کا پر کیف منظر یہ تھا کہ جس وقت مولانا محمد علی خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا رہے تھے، تو ان کے روتے روتے گھگھی بندھ گئی تھی، ان کے ساتھ مسجد میں ہزاروں کا مجمع تھا، زار و قطار رو رہا تھا، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا تو اس کی مصلحتوں کی وجہ سے قبول نہیں ہوئی، لیکن یہ کتنی صداقت اور حقیقت سے پر ہے، اس دعا کو مانگے، چھیالیس سال سے زیادہ گذر گئے، لیکن دنیا کے تہذیبی اور تمدنی ترقی اور انسانی محبت کے دعوؤں کے باوجود شیطانی طاقت کے نشے کی سرشاری ابھی تک دیکھنے میں مصروف ہے، آہنی آلات سے سطوت و جبروت کا سکہ ابھی تک بٹھایا جا رہا ہے، ابلیسی قوت کمزور اور ناتواں قوم کی گردن میں طرح طرح کے طوق لعنت ڈال رہی ہے، اور انسان اپنی زبان حال سے اب بھی خدا سے فریاد کر رہا ہے، ع

دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اور خود مسلمانوں کی بے زبانی اپنے خالق سے یہ کہہ رہی ہے،

کیونکر خس و خاشاک سے دب جائیں مسلماں
مانا کہ تب و تاب نہیں اسکے شرر میں

مخلوط انتخاب کا مسئلہ

۱۹۲۷ء کے شروع میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے لئے دہلی میں ایک آل پارٹیز کانفرنس کی گئی، یہ ناکام رہی، تو مولانا محمد علی نے یہ کوشش کی کہ مسلمان چند باتوں پر متفق ہو جائیں، تو ان کو کانگریس سے منوانے کی فکر کی جائے، چنانچہ ۲۰ر اپریل ۱۹۲۷ء کو دہلی میں مسلمانوں کا ایک نمائندہ جلسہ ہوا، جس کی صدارت محمد علی جناح نے کی، اس میں یہ طے پایا کہ سندھ کو بمبئی سے علٰحدہ کر کے جدا صوبہ قرار دیا جائے، سرحد و بلوچستان میں اصلاحات جاری کی جائیں، سندھ، بلوچستان اور سرحد میں ہندوؤں کو وہی رعایت دی جائے جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو دی جائے، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت حقیقی نہیں ہے، بلکہ عددی ہے، اس لئے ان دونوں صوبوں

ہیں ان کی نشستیں محفوظ رکھی جائیں، مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی نمائندگی ۳۳ فی صدی ہو، اس میں کوئی ایسی قرارداد یا تحریک منظور نہ کی جائے، جس کی مخالفت کسی ایک ملت کے ۳/۴ ارکان کریں، اگر ان امور کا تصفیہ ہو جائے تو مسلمان مخلوط انتخاب کو منظور کر لیں،

مولانا محمد علی نے یہ تجویزیں کانگریس سے بھی منوا لیں، ان ہی کے اصرار سے محمد علی جناح نے کلکتہ کے اجلاس میں مسلم لیگ سے بھی منظور کرا لیں، اس وقت مخلوط انتخاب کو مسلمانوں سے منوانا کوئی معمولی بات نہ تھی، لیکن ان تجویزوں پر بحث شروع ہوئی تو یہ جھگڑا اٹھ گیا کہ اکثریت کے لئے کسی جگہ نشستیں متعین نہ رہیں، اس سے بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت خطرہ میں پڑ جاتی تھی، اسلئے مسلمان اس کے لئے راضی نہ ہوئے اور یہ تجویزیں کاغذ پر لکھی رہ گئیں،

رنگیلا رسول

جولائی ۱۹۲۷ء میں ایک عجیب جھگڑا اٹھ گیا، پنجاب کے راج پال نامی ایک مصنف نے رنگیلا رسول لکھ کر مسلمانوں میں بڑا اشتعال پیدا کر دیا، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی اہانت آمیز تصویر پیش کی گئی تھی، مسلمانوں میں بڑی بیزاری اور برہمی پھیلی، راج پال کے خلاف پنجاب ہائی کورٹ میں مقدمہ کیا گیا، تو وہاں کے جسٹس دلیپ سنگھ نے اس کو سزا دینے کے بجائے رہا کر دیا، کیونکہ کسی قانون کے ماتحت وہ سزا کا مستحق نہ تھا، اب ہنگامہ جسٹس دلیپ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، جلسے ہوئے، جلوس نکلے، مسلمانوں نے اپنے کو قید و بند کے لئے پیش کیا، بڑی نازک صورت حال پیدا ہو گئی، مولانا محمد علی کو بھی اس سے بڑا دکھ ہوا اور انھوں نے بیانات دیئے، اور مضامین لکھے، کہ اس کتاب کی اشاعت سے (۱)

(۱) بانی اسلامؐ کی اہانت کی گئی، (۲) مسلمانوں کی توہین ہوئی (۳) بانی اسلامؐ کے خلاف نفرت پھیلائی گئی، (۴) مسلمانوں کے مذہب کو قابل نفرت قرار دیا گیا، (۵) مسلمانوں کے جذبات مجروح کئے گئے، (۶) مسلمانوں کو ذلیل دکھایا گیا، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس کتاب کے مصنف کو بری کر دیا گیا، تو اس کے لئے جسٹس دلیپ سنگھ قابل الزام نہیں ہو سکتے، بلکہ سارا الزام برطانوی حکومت کے ناقص قوانین پر آتا ہے، جن میں ترمیم کی ضرورت ہے، اور انھوں نے قانون کا ایک ایسا مسودہ تیار کیا، جس کی رو سے کوئی کسی نبی یا ولی یا مقدس بزرگ کی توہین کر کے کسی فرقہ کا دل دکھائے، تو وہ قید اور جرمانے کی سزا کا مستحق سمجھا جائیگا، یہ مسودہ مرکزی اسمبلی میں قانون بنانے کے لئے پیش بھی کیا گیا، لیکن اس میں کچھ ایسی ترمیمیں ہوئیں کہ یہ قانون پھر بھی ناقص رہا، اس سلسلہ میں مولانا محمد علی کا کارنامہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو اشتعال پیدا ہوا تھا، اس سے شدید قسم کے ہندو مسلم فسادات کا احتمال پیدا ہو گیا تھا، لیکن مولانا محمد علی نے اس کا رخ موڑ دیا،

ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی کوشش

اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادات پھر شروع ہو گئے، جن سے پورے ہندوستان کو دکھ تھا، مولانا شوکت علی کی کوشش سے پھر ایک بار اتحاد کانفرنس شملہ میں ۱۶ ستمبر سے ۲۲ ستمبر سنہ تک کی گئی، ڈاکٹر مونجے، مدن موہن مالوی، جے رام داس دولت رام، رائے کدار ناتھ، دیوان سردول سنگھ کے ساتھ مولانا محمد علی، محمد علی جناح، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابو الکلام آزاد اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو بھی شریک ہوئے، محمد علی جناح نے اس کی صدارت کی، لیکن اس کانفرنس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا، اسی کے بعد کانگریس کے صدر سری نواس آئنگر نے کلکتہ میں ایک اتحاد کانفرنس بلائی جس میں

یہ طے پایا کہ ہندو مسلمان رہنما ملک کا دورہ کریں گے میل ملاپ کی فضا پیدا کریں، لیکن یہ فضا کچھ تو ضرور پیدا ہوئی، لیکن پھر ختم ہو گئی،

کانگریس اور مسلمان

اس وقت تک کانگریس کی زبردست تنظیم گاؤں گاؤں تک پھیل رہی تھی، اور اس کی آواز گوشہ گوشہ میں گونج رہی تھی، گاندھی جی اس کی روح تھے، تو جواہر لال نہرو اس کے جسم تھے، کانگریس کی رہنمائی میں ہندوستان کی سیاست ایک نئی کروٹ ضرور لے رہی تھی لیکن اس میں وہ جوش و خروش باقی نہیں رہا تھا، جو خلافت کانفرنس اور کانگریس نے مل کر ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں پیدا کیا تھا، ہندو مسلمانوں کے اختلافات بھی بڑھ رہے تھے، اس سلسلہ میں یہ بحث اٹھ کھڑی ہوئی کہ کانگریس کی تنظیم اور اس کی جدوجہد میں مسلمانوں کا کیا حصہ ہے، ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ گاندھی جی علی برادران کے مشورے کے بغیر کچھ بھی نہ کرتے، لیکن بدلی ہوئی سیاسی فضا میں یہ بحث بھی چل نکلی کہ کانگریس کو ملک میں مقبول بنانے میں مسلمانوں کا بھی کوئی حصہ ہے بھی کہ نہیں، مولانا محمد علی اس سلسلہ میں کب خاموش رہ سکتے تھے، ستمبر ۱۹۲۷ء میں وہ پشاور گئے، وہاں ان کا ایسا شاندار استقبال ہوا کہ خود ان کو حیرت تھی، ان کا خود بیان ہے کہ ہندوستان بھر میں کسی اور جگہ ان کا استقبال اس گرمجوشی اور خوش سلیقگی سے نہیں کیا گیا، اس سے یہ ظاہر ہے کہ ان کی مقبولیت میں کبھی کمی نہیں ہوئی تھی، گو وہ کانگریس سے دور ہو رہے تھے، یا خود کانگریس ان سے دور ہو رہی تھی، جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے، پھر بھی وہ اس وقت تک کانگریس کے ساتھ تھے، مگر بقول ان ہی کے وہ اپنے مخالفوں کے نرغہ میں تھے، پشاور کے جلسہ کی تقریر میں مولانا محمد علی نے جہاں اور باتیں کہیں وہاں یہ بھی کہا،

میں جب کبھی اپنے اخبار میں کچھ لکھتا ہوں، تو ہر لفظ کے انتخاب میں یہ خیال رکھنا پڑتا

ہے کہ ہندو اس پر کیا کہیں گے، کانگریس والے کیا خیال کریں گے، خلافت والوں پر اس کا کیا اثر ہوگا، مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا اور حکومت کے دل میں یہ کیا اثرات پیدا کریں گے، اور سب سے آخر میں یہ کہ خدا کیا کہے گا، آج تقریر کرتے ہوئے بھی یہی حالت ہے، میں دشمنوں کے نرغہ میں ہوں، مگر میری تقریر آپ کو یا ہندوؤں کو یا حکومت کو خوش کرنے کے لئے نہیں، میری کوشش محض یہ ہے کہ خدا راضی ہو، اور اسی پر بھروسہ رکھتے ہوئے اپنے خیالات پیش کرتا ہوں، اس امر کا لحاظ نہیں کرتا ہوں کہ آپ انھیں پسند کریں گے یا ناپسند، دعا کریں کہ خدا مجھے اس مقصد میں کامیاب کرے،

"جب ہندو اور مسلمان متحدہ و مشترکہ طور پر غلامی کا جوا گردن سے اتار پھینکنے کی جدوجہد میں مصروف تھے، اس وقت بعض خود غرض مسلمان ہم کو کہتے تھے کہ ہم نے ہندوؤں کی غلامی قبول کر لی، ہم گاندھی پرست ہو گئے، اور مسلمانوں کو برباد کر رہے ہیں، اسی طرح بعض ہندو بھی ایسے تھے جو مہاتما گاندھی کو متہم کرتے تھے، کہ علی برادران کی رفاقت کر کے وہ ۲۲ کروڑ ہندوؤں کو سات کروڑ مسلمانوں کا غلام بنا کر ان کا ستیاناس کر رہے ہیں، لیکن میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ جس وقت محمد علی شوکت علی ڈاکٹر کچلو وغیرہ اسی تحریک کی وجہ سے جیل میں گئے تھے تو تم میں سے کسی نے اس وقت کی فضا کی خرابی کی شکایت کی تھی، (مجمع سے نہیں نہیں کی آواز) اچھا اگر نہیں تو تم ہی ایمان سے بتاؤ کہ اس میں میرا کیا قصور ہے"

"کانگریس کو انڈین نیشنل کانگریس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا ہے، اس سے پہلے وہ خوش وضع، عافیت پسندوں کی تفریح گاہ تھی، جو تیار کردہ تقریریں شاندار الفاظ میں کرنے اور چند تجویزیں منظور کرانے کی خواہش سے سال میں ایک دفعہ جمع ہو کر نشستند و گفتند و برخاستند کا نظارہ پیش کرتے تھے، مگر جس دن سے محمد علی اور شوکت علی آئیں

شامل ہوئے، امرت سر اور کلکتہ کانگریس کو یاد کرلو اسی دن سے اس میں جان پڑگئی، چنانچہ کلکتہ میں صدر لالہ لاجپت رائے کی مخالفت کے باوجود کانگریس نے ترک موالات کو اپنا شعار بنایا، اور یہ حقیقت ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رہے گی، کہ سب جلیل القدر ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتے رہے، کیونکہ وہ کہتے تھے، اور بالکل بجا کہتے تھے کہ یہ تمام دورے تحریک خلافت سے متعلق ہیں ہماری قید کے بعد بھی مہاتماجی نے دورے کے مصارف خلافت کے سرمائے سے لئے حتی کہ کانگریس کے لئے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے ان دوروں کے مصارف بھی مجلس خلافت نے ادا کئے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کانگریس کی روح رواں تحریک خلافت اور مجلس خلافت تھی، اور یہ پہلا موقع تھا جب حکومت کو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ ہندوستانی فی الواقع کچھ کر سکتے ہیں، مجھ سے نہیں، لارڈ ریڈنگ اور مسٹر جان سیفی سے دریافت کر لیجئے کہ اس وقت حکومت کی قوت کے ایوان میں کیسا زلزلہ آگیا تھا، اب کہ تحریک خلافت سرد پڑگئی ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر تحریک کانگریس بھی، اسی لئے چیف کمشنر کو میرے آنے پر کوئی تشویش نہیں اور وہ آرام کی نیند سو رہے تھے" (ہمدرد ۲۵ ستمبر ۱۹۲۷ء)

سائمن کمیشن کا تقرر | ان اختلافات کے باوجود آزادی کی جنگ جاری تھی، جس سے برطانوی حکومت پر دباؤ پڑ رہا تھا، وہ آزادی دینا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن آزادی دینے سے انکار کرنا بھی اس کی بین الاقوامی مصلحتوں کے خلاف تھا، اس دباؤ کی وجہ سے اس نے ایک کمیشن نومبر ۱۹۲۷ء میں سر جان سائمن کی صدارت میں مقرر کیا، جس کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ گذشتہ اصلاحات سے اس وقت تک ہندوستان نے جتنی ترقی کر لی ہے، اس کا جائزہ لے کر یہ سفارش کرے کہ ہندوستان میں کیا مزید اصلاحات کی جا سکتی ہیں" تاکہ یہاں ایک ذمہ دار حکومت قائم ہو سکے، اس زمانہ میں برطانیہ

میں لیبر پارٹی کی حکومت تھی، اس کے وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ تھے، اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو نہیں رکھا گیا، جس سے ہندوستان میں بڑی مخالفت ہوئی اس کے بعد ہندوستانیوں کی اشک شوئی کے لئے کچھ ہندوستانیوں کو اس کی ذیلی کمیٹی میں نامزد کیا گیا، جو زیادہ تر برطانوی حکومت کے حامی اور ازلی وفادار سمجھے جاتے تھے، اس کے صدر سر سنکرن نائر مقرر ہوئے، پھر بھی کمیشن کا پرزور مقاطعہ ہوا، اور جب یہ ہندوستان آیا تو سائمن کمیشن گو بیک" کے نعروں سے پورا ملک گونج اٹھا، اور بقول پنڈت جواہر لال نہرو یہ تین الفاظ کمیشن والوں کو بھوت بن کر ستاتے رہے، مولانا محمد علی نے بھی مسلمانوں کی اکثریت کو اس کے بائیکاٹ پر آمادہ کیا، اور اپنے اخبار ہمدرد میں اس کے خلاف مسلسل مضامین لکھے، پہلے تو ہندوستان کی غلامی پر نوحہ اس طرح کیا،

"ہم ہندوستانی ساری خدائی کے انسانوں کا پانچواں حصہ ہیں، مگر غلام بن بیٹھے ہیں، ایک ایسی قوم کے جو تعداد میں خود ہمارا ساتواں آٹھواں حصہ ہے، اور ہم سے سات ہزار میل کے فاصلہ پر سات سمندر پار رہتی ہے، حقیقتاً تو ہم غلام ہیں، ان ساڑھے تین ہزار انگریزوں کے جو ہندوستان میں عمال حکومت ہیں، یا ان چالیس پینتالیس ہزار گوروں کے جو برطانیہ کی فوج میں داخل ہیں، اور ہم کو مرعوب کئے ہیں، بہرحال ہم غلام ہیں چالیس پینتالیس ہزار کے، ہم خدا کے دیئے ہوئے دل و دماغ کو کام میں لاکر منزل مقصود کی طرف بڑھنے کا فیصلہ بھی نہیں کر سکتے، نہ خدا کے دیئے ہوئے پاؤں کو حرکت دیکر اس طرح بڑھ سکتے ہیں، نہ تیز روی سے کام لے کر منزل مقصود تک جلد سے جلد پہونچ ہی سکتے ہیں،

بلکہ ہمارے لئے قطعِ منازل کا فیصلہ بھی ایک دوسری قوم کے نائب کریں گے اور اگر انھوں نے اس کی اجازت دے دی تب بھی ہم تیز روی سے کام نہیں لے سکتے اگر وہ آہستہ خرامی کا حکم صادر فرما دیں"

پھر برطانوی حکومت کے ان وفادار ہندوستانیوں پر یہ لکھ کر طنز کیا جو امید لگائے بیٹھے تھے کہ ان کی وفاداری کے صلہ میں ان کو کمیشن میں شریک کیا جائیگا،

"ہر وقت کمیشن کا انتظار لگا رہتا ہے، آہٹ پہ گوش، در پہ نظر ہے، کہ دیکھئے کب آتا ہے، کون کون آتا ہے، ہم میں سے کس کس کو شرف ہمرکابی حاصل ہوتا ہے کس کی طرف نظر عنایت ہے، کس پہ عتاب ہے، ہمارے کشکول گدائی میں دیکھئے کیا ڈالا جاتا ہے، یہی وہ کشمکشِ انتظار ہے، جس کے متعلق ایک شاعر نے خوب کہا ہے:-

وائے اس شخص کی قسمت جو تجھے یاد کرے	ہائے اس شخص کی قسمت جو تجھے یاد رہے

یہی وہ کشمکشِ انتظار ہے، جس کی دل خراش صعوبت سے تنگ آکر کسی شاعر نے کہا ہو:

اے نگاہ کرم! نہ رکھ دھوکے میں	اب بھی کہدے کہ مجھے مد نظر کچھ بھی نہیں"

پھر اپنے ان کانگریسی ساتھیوں پر بھی چوٹ کی جو سوراج پارٹی بنا کر مرکزی اور صوبائی قانونی مجلسوں میں اس امید پر جا بیٹھے تھے کہ اندر جاکر وہ آزادی کی جنگ لڑنے میں بہت کچھ مراعات حاصل کر سکتے ہیں، انکے متعلق مولانا محمد نے انے لکھا،

"ان وفاداروں کو چھوڑ دیجئے جو ہر حال میں اپنی سرکار سے راضی ہیں، ان کو چھوڑ کر ہندوستان میں کون تھا، جو سنہ ۱۹۱۹ء کے آخر میں جب کہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا اعلان کیا گیا، ان سے خوش اور ان پر مطمئن تھا، لیکن باوجود خلافت اور پنجاب کے بارے میں برطانوی حکومت کے فیصلے کے جس نے امرتسر کانگریس کے جوابی تعاون والے فیصلے کو بیکار کرکے گھورے پر پھینکوا دیا تھا، اور کلکتہ کی اسپیشل کانگریس سے اس کا فیصلہ صادر کرا دیا تھا کہ کونسلوں کے انتخابات کو ہاتھ نہ لگایا جائے، ہمارے ہی بھائیوں میں سے ایک جماعت نکل آئی جس نے اس امید پر کہ دس سال بعد یا شاید اس سے بھی پیشتر کچھ اور مل جائیگا، جو تلافی مافات کر دیگا، انتخابات میں حصہ لیا اور کونسلوں کی ہر نشست کو پر کر دیا، مسٹر سی، آر، داس، موتی لال نہرو، مسٹر سری نواس اینگر، مسٹر کیلکر اور دوسرے بعض سوراجی (؟)

[Left page, as printed:]

والے فیصلے کو بیکار کرکے گھورے پر پھینکوا دیا تھا، اور کلکتہ کی اسپیشل کانگریس سے اس کا فیصلہ صادر کرا دیا تھا کہ کونسلوں کے انتخابات کو ہاتھ نہ لگایا جائے، ہمارے ہی بھائیوں میں سے ایک جماعت نکل آئی جس نے اس امید پر کہ دس سال بعد یا شاید اس سے بھی پیشتر کچھ اور مل جائیگا، جو تلافی مافات کر دیگا، انتخابات میں حصہ لیا اور کونسلوں کی ہر نشست کو پر کر دیا، مسٹر سری نواس شاستری، مسٹر سپرو، وا متر، چنتامنی صاحب جیسے لبرلوں نے بھی موڈی مین کمیٹی کے سامنے آکر صاف صاف کہدیا کہ یہ دوعملی ناقابل عمل ہے، مگر اس پر بھی نہ صرف لبرل اس کو چلاتے رہے بلکہ تارک تعاون کانگرسی سوراجیوں میں سے بھی جوابی تعاون کرنے والے اسی دوعملی کو چلانے کے لئے پیدا ہو گئے، یہ تعاون کس عنایت کا "جواب" تھا، جہاں مانٹیگو چمکارتا تھا، وہاں برکن ہڈ صاحب دھتکارتے بلکہ لات مارتے تھے، کیا لالہ لاجپت رائے صاحب، جیکر صاحب، کیلکر صاحب اور ڈاکٹر مونجے کے صوبجات متوسطہ نے اس دھتکار اور مار کے جواب میں جوابی تعاون کیا ہے، حقیقتاً یہ جوابی تعاون نہ تھا، بلکہ سوالی تعاون تھا، ان سب بھکاریوں کا دست سوال لارڈ برکن ہڈ کے سامنے دراز تھا، اور سب سنہ ۱۹۱۹ء کے اصلاحات کے بعد بھی پیٹ کو خالی پاکر سنہ ۱۹۲۶ء کی بھیک کے ٹکڑے کے منتظر تھے"!

مولانا محمد علی کی ان تحریروں سے ظاہر ہوگا کہ وہ آزادی کے مطالبہ میں کس قدر انتہا پسند رہے، وہ آزادی کی خاطر ہمیشہ لڑنے کی ترغیب دیتے اور اس کی بھیک مانگنے کی مذمت کرتے رہے، وہ انگریزوں کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے اسلئے وہ سمجھتے تھے کہ ان کو کس طرح دبایا جا سکتا ہے، وہ ان کی سیاسی فریب کاریوں اور چالبازیوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے، اس لئے جو ہندوستانی مدبران کی لگاوٹ کی باتوں سے متاثر تھے، ان کو یہ لکھ کر مجروح کیا،

"عربوں کی ایک پرانی مثل ہے، کہ اپنی گھروالی سے ہر کام میں مشورہ کرلیا کرو لیکن کیا وہی کرو جو تم خود مناسب سمجھو، کمیشن نے تو کسی ہندوستانی کو اپنی گھروالی بنانا قبول نہیں کیا، ہاں یوں جس کا جی چاہے کونسلوں اور اسمبلی سے نکل کر اس کے گھر پڑ جائے، لیکن لیڈران قوم مایوس نہ ہوں، اللہ نے چاہا تو ایک دن وہ بھی آنے والا ہے، کہ کمیشن سے بھی ایک اعلیٰ اور ارفع جماعت یعنی پارلیمنٹ کی جوائنٹ کمیٹی انھیں اپنے حرم میں داخل فرمائے گی، اور اپنی گھروالی بناکر ان سے اصلاحات کے بارے میں (اور ممکن ہے کہ اصلاحات اس بار نہ ملیں صرف فسادات ملیں) ضرور مشورہ لے گی، لیکن عرب شوہر کی طرح کریں گے، وہ بھی وہی جو خود وہ چاہینگے"

مولانا محمد علی اس کے قائل نہ تھے، کہ جو طرز حکومت یورپ میں قائم ہے وہی ہندوستان کے لئے موزوں اور مناسب ہے، اسی لئے وہ برطانوی حکومت کی ہر اس سیاسی اصلاح کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، جو وہ اپنے طرز اور مزاج کے مطابق اس کے لئے سفارش کرتے، ان کا خیال رہا کہ ہندوستان کا طرز حکومت ہندوستان کے مزاج کے مطابق ہونا چاہئے، اسی لئے انھوں نے سائمن کمیشن پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ

"اس سے زیادہ مضحکہ انگیز کیا چیز ہوگی کہ کابینہ وزارت برطانیہ ایسے سات ممبر پارلیمنٹ کو ہندوستان بھیج رہا ہے جو ہندوستان سے آج تک بالکل ناآشنا رہے ہیں، تاکہ یہ چھ ہفتوں کے اندر نہ سہی چھ ماہ کے باہر ہی سہی اس امر کا فیصلہ کریں کہ ایک مغربی نظام ہم مشرقیوں کے لئے مناسب اور موزوں بھی ہے، یا نہیں، اور پھر ہم مشرقیوں کے لئے یہ مغربی ایک مناسب اور موزوں دستور اساسی وضع فرمائیں، اگر مشرق اور مغرب میں فروعی امتیازات نہ ہوتے تب تو شاید ممکن بھی ہوتا کہ سر جان سائمن اور ان کے رفقائے مغربی ہم مشرقیوں کے لئے ایک مناسب، اور موزوں دستور اساسی

وضع فرمادیتے، لیکن جب ان امتیازات کے وجود کو تسلیم کرلیا جاتا ہے، تب تو اس کو بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہم مشرقیوں کے لئے ہم مشرقی ہی مناسب اور موزوں دستور اساسی وضع کرسکتے ہیں، نہ کہ یہ مغربی، پارلیمنٹ کے مغربی نمائندے، اگر مراقش کے لئے بنیتھم جیسا ماہر قانون اساسی بھی مناسب اور موزوں دستور و آئین نہیں وضع کرسکتا تھا تو ہندوستان کے لئے برکن ہڈ، ریڈنگ اور سائمن جیسے ماہرین بھی مناسب اور موزوں دستور آئین وضع نہیں فرماسکتے، ہماری قسمت کا فیصلہ خود ہمارے ہاتھ میں ہونا چاہئے جب تک ہم فاتر العقل نہ ثابت ہوجائیں، اپنے بیوی بچے کا انتظام ہمیں کو کرنا پڑیگا، کوئی دوسرا یہ کہہ کر ہمارے خانگی امور کی دیکھ بھال اپنے ذمہ نہیں لے سکتا کہ میں اس دیکھ بھال کی تم سے زیادہ اہلیت رکھتا ہوں، اپنا حلق اپنے ہی تھوک سے تر کیا جاسکتا ہے، دوسرے کا تھوک گندگی اور غلاظت ہے"

مولانا محمد علی نے اوپر جو کچھ لکھا ہے، اس کی روشنی میں ہم اپنے اس برطانوی پارلیمانی طرز حکومت کا تجزیہ کرسکتے ہیں، جو اس وقت ہمارے یہاں گذشتہ چھبیس سال سے قائم ہے، ہم اپنے ناظرین کے فہم و ادراک پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اس کا فیصلہ خود کریں، کہ اس سے ہمارا حلق تر ہو رہا ہے، یا اس میں گندگی اور غلاظت پیدا ہو رہی ہے،

برطانیہ کے وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے یہ کمیشن مقرر کیا تھا، ان کے بارہ میں مولانا محمد علی کی رائے بہت ہی خراب تھی، ان کو وہ انتہائی درجہ کا جھوٹا، فریبی، بدعہد اور کینہ پرور انگریز سمجھتے رہے، اس لئے انھوں نے اس کی تلقین کی کہ اس انگریز وزیر اعظم سے کسی بھلائی کی امید نہ رکھنی چاہئے، اور جب یہ وزیر اعظم صاحب اپنی توانائی اور استبدادیت کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے، تو مولانا محمد علی نے

بڑی جرأت کے ساتھ ان کے خلاف "بھائی رام جی میکڈانلڈ کے کچھ حالات" کے عنوان سے مضامین لکھنے شروع کئے، اور کچھ گذشتہ واقعات کو قلمبند کر کے ان کے جھوٹ بولنے کا پول اس طرح کھولا،

"جب کانپور کی مسجد شہید ہوئی .... تو اس خبر وحشت اثر کو پڑھتے ہی ایک تار تو مسٹن صاحب کے نام دیا کہ مجھے اجازت دی جائے کہ جو خط و کتابت اور تارم تار آپ کے ساتھ گذشتہ ڈیڑھ سال میں ہوئی ہے، اسے شائع کر دوں اور دوسرا تار بھائی رام جی "میکڈانلڈ کے نام دیا کہ ہمارے ساتھ عمال حکومت نے یہ ظلم کیا ہے، آپ پارلیمنٹ میں اس سوال کو پیش کریں، اور ہماری مسجد کے شہید شدہ حصے کو دوبارہ تعمیر کا وزیر ہند کی طرف سے حکم دلوا دیں، ۲ر جولائی کے تار کا جواب نہ مجھے تار سے ملا، نہ خط سے، نہ پارلیمنٹ میں اس مرد خدا نے کوئی سوال ہی کیا، جب مسٹر جسٹس سید وزیر حسن اور میں ستمبر ۱۹۱۳ء میں اسی لئے انگلستان گئے، تو یہ بھی مجھ سے ملنے ہماری قیامگاہ پر تشریف لائے، میں نے تار کا جواب نہ آنے کی شکایت کی تو فرمایا بھئی واقعہ یہ ہے کہ تمہارا نام اس قدر عام ہے کہ میں سمجھ نہ سکا کہ تار تم نے بھیجا ہے یا کسی اور محمد علی نے اور یہ بھیجا بھی بمبئی سے گیا تھا، اگر دہلی سے آیا ہوتا تو میں سمجھ جاتا کہ تمہیں نے بھیجا ہے، مجھے اس جواب کو سن کر تعجب بھی ہوا، اور غصہ بھی آیا، اس لئے کہ میں نے تار میں صاف لکھدیا تھا کہ محمد علی اڈیٹر کامریڈ ارسال کرنے والا ہے، تاکہ بمبئی کے مقام ارسال سے باعث کوئی غلط فہمی واقع نہ ہو، جب آپ نے دیکھا کہ چال کارگر نہ ہوئی تو فرمایا کہ ہاں میں بھولا، واقعہ یوں تھا کہ تمہارا تار ملا تو میں نے احتیاط سے اپنی ڈاک کے ساتھ رکھ دیا کہ اس کے متعلق مزید حالات دریافت کر کے کارروائی کروں گا، مگر پھر بہت سے اور لوگوں کے خطوط آ گئے، اور یہ تمہارا تار ان کے

نیچے کچھ اس طرح دب گیا کہ آج تک وہ پڑا ہوا ہے، تم تو جانتے ہی ہو گے کہ کس طرح بعض اوقات ضروری کاغذات اس طرح اور کاغذات کے نیچے دب کر رہ جاتے ہیں، اور حافظہ سے ان کی یاد تھوڑے دن بعد محو ہو جاتی ہے، میں اسی دن سے سمجھ گیا کہ یہ کس قماش کے بزرگ ہیں"

ریمزے میکڈانلڈ کے ظرف کا پول ایک دوسرا واقعہ بھی لکھ کر کھولا، جب وہ وفد خلافت لے کر انگلستان گئے، تو اس وقت ریمزے میکڈانلڈ پارلیمنٹ کے ممبر نہ تھے لائڈ جارج کی لبرل پارٹی سے شکست کھا گئے تھے، لیکن لیبر پارٹی کے سکریٹری تھے، مولانا محمد علی وفد لے کر انگلستان پہونچے تو انگلستان کے تمام ضروری سیاست دانوں سے ملتے رہے جنہیں حکومت کے وزراء کے علاوہ، کلائینس، نیل میکنس، کرنل ویجووڈ، سنوڈن، ٹامس وغیرہ جیسے حزب مخالف کے لیڈر بھی تھے، مگر ان کو ریمزے میکڈانلڈ سے ملنے کا موقع نہ مل سکا، اسی زمانہ میں لیبر پارٹی کا ایک جلسہ لندن میں ہونے والا تھا، مولانا محمد علی اس جلسہ میں وفد کی کچھ باتیں پیش کرنا چاہتے تھے، اس لئے جلسہ کے کارکنوں سے ملے، تو ان لوگوں نے کہا کہ اب تو پروگرام طے ہو چکا ہے، تاہم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ سکریٹری ہیں، ان کو اختیار ہے کہ اگر چاہیں تو پروگرام میں اب بھی وقت نکال سکتے ہیں، وہ تو تمہارے پرانے دوست ہیں، ان سے کہو وہ ضرور تھوڑا سا وقت تو نکال ہی دیں گے، اس کے بعد کی کہانی مولانا کی زبانی سنئے،

"میں خوش خوش آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، ۱۹۱۳ء کے تلخ تجربے سے کسی قدر غیر مطمئن بھی تھا، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس شخص نے کس تلخی کے ساتھ مجھے جواب دیا، ایک منٹ رکنا اس کو گوارا نہ تھا، راستہ چلتے چلتے فرمایا کہ ہرگز ہرگز نہیں، ہمارا پروگرام یوں ہی پر ہے،

اس لئے وقت نکالنا مشکل ہے، مجھے اس انکار سے سخت رنج ہوا، مگر رنج کے علاوہ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی، جب مجھے اس انکار کا اصلی سبب معلوم ہوا، اس لئے کہ آپ سے نہ رہا گیا، اور آپ نے اسی وقت فرمایا کہ تم نے تو مجھے بالکل ہی بھلا دیا، تم مجھ سے آج ملتے ہو، اتنے دن کہاں تھے، میں نے کہا کہ میں لندن سے ایک عرصے سے باہر تھا، اور چونکہ وہ بھی اس وقت لندن میں نہ تھے، جب ہم لوگ شروع شروع ہندوستان سے آئے تھے، اور پارلیمنٹ والوں ہی سے ملنا، اس وقت سب سے زیادہ ضروری تھا، اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی، اس پر فرمایا کہ تم ان ناکارہ لوگوں کے پاس گئے اور مجھے بالکل ہی بھلائے رکھا، آج مجھے یاد فرمایا، میں تمھارے لئے بالکل وقت نہیں نکال سکتا، جو شخص ایک دن برطانیہ کا وزیر اعظم ہونے والا تھا، وہ اتنا کم ظرف اور تنگ دل ہو، مجھے سخت حیرت ہوئی، کہ حزب عمال کے لیڈروں سے ان کی اس قسم کی مخالفت تھی، کہ میرا ان سے ملنا اتنا ناگوار ہوا، جو شخص رشک وحسد میں اس قدر ڈوبا ہوا ہو، کہ ہندوستان اور ترکی کے ساتھ انصاف اور خود برطانیہ کے مفاد کا ذرا خیال نہ رکھے، تو صرف اس کا فلاں شخص حزب عمال کے لیڈروں سے کیوں ملا، مجھ سے کیوں نہ ملا، اس سے بھلا کسی بھلائی کی امید ہو سکتی ہے، باوجود ان بزرگ کے انکار کے مسٹر کلائنس اور مسٹر لینسبری نے صدر کانفرنس سے کہہ کر مجھے پانچ منٹ تو تقریر کے لئے دلا ہی دیئے، اور جس انداز سے میں نے تقریر کی، اس سے سامعین اتنا محظوظ ہوئے کہ صدر کی گھنٹی تین بار بجی مگر ہر بار سامعین چلا چلا کر کہتے رہے کہ ابھی اور تقریر کرنے دیجئے، انھیں نہ روکئے،

اس کے بعد مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہی ریمزے میکڈانلڈ صاحب وزیر اعظم ہوئے، لیکن ترکی کے ساتھ موصل کے مسئلے میں، مصر کے ساتھ سوڈان، سوئز اور دوسرے مسائل میں اور ہندوستان کے ساتھ گول میز کانفرنس کے مطالبے اور بنگال آرڈیننس کے معاملوں میں اس شخص نے جو کارروائی کی وہ قدامت پسند سے قدامت پسند اور استبدادی سے استبدادی آمریت کی کارروائی سے کسی طرح کم نہ تھی، جو ذاتی تجربہ خود مجھے اس کا ہو چکا تھا، اس کے بعد ان کارروائیوں نے مجھے یقین دلایا کہ یہ شخص اس آئینی کمیشن کے معاملے میں ہمارے خلاف جائیگا، اور جس طرح پہلے ترکی، مصر اور ہندوستان کے ساتھ اس نے مستبدانہ اور ناانصافانہ سلوک کیا ہے، اسی طرح پھر ہمارے ساتھ ویسا ہی سلوک ہونے دیگا، اور اس کی اور اس کی پارٹی کی کمک پر بھروسہ ہندوستانیوں کی سخت حماقت ہے۔" (ہمدرد ۲۹ نومبر ۱۹۲۶ء)

مولانا محمد علی نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے سائمن کمیشن کی سخت مخالفت کی، ان کا پیام تھا کہ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر سائمن کمیشن کی آمد کو ناکام بنا دیا تو ہمیشہ ہمیشہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمارا نام زریں حروف سے لکھا جائیگا، مسلم لیگ بھی مولانا محمد علی کی رائے کے ساتھ ہو گئی، لیکن پنجاب کے سر محمد شفیع مقاطعہ کے خلاف تھے، اس لئے انھوں نے مسلم لیگ سے علٰحدہ ہو کر ایک علٰحدہ لیگ قائم کی، جو "شفیع گروپ" کے نام سے موسوم ہوئی، حکومت کے پرستاروں کی کمی نہ تھی، اس لئے ہندو اور مسلمان دونوں میں ایسے افراد حاصل ہو گئے، جنھوں نے کمیشن کا ساتھ دیا، اس کی جا بجا دعوتیں بھی کیں، لیکن مجموعی حیثیت سے اس کا زبردست بائیکاٹ ہوا، جس کو حکومت نے بھی محسوس کیا،

اس نے وقت نکالنا مشکل ہے، مجھے اس انکار سے سخت رنج ہوا، مگر رنج کے علاوہ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی، جب مجھے اس انکار کا اصلی سبب معلوم ہوا، اس لئے کہ آپ سے نہ رہا گیا، اور آپ نے اسی وقت فرمایا کہ تم نے تو مجھے بالکل ہی بھلا دیا، تم مجھ سے آج ملتے ہو، اتنے دن تھے کہاں تھے، میں نے کہا کہ میں لندن سے ایک عرصے سے باہر تھا، اور چونکہ وہ بھی اس وقت لندن میں نہ تھے، جب ہم لوگ شروع شروع ہندوستان سے آئے تھے، اور پارلیمنٹ ڈول والوں ہی سے ملنا، اس وقت سب سے زیادہ ضروری تھا، اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی، اس پر فرمایا کہ تم ان ناکارہ لوگوں کے پاس گئے اور مجھے بالکل ہی بھلائے رکھا، آج مجھے یاد فرمایا، میں تمھارے لئے بالکل وقت نہیں نکال سکتا، جو شخص ایک دن برطانیہ کا وزیر اعظم ہونے والا تھا، وہ اتنا کم ظرف اور تنگ دل ہو، مجھے سخت حیرت ہوئی، کہ حزب عمال کے لیڈروں سے ان کی اس قسم کی مخالفت تھی، کہ میرا ان سے ملنا اتنا ناگوار ہوا، جو شخص رشک وحسد میں اس قدر ڈوبا ہوا ہو، کہ ہندوستان اور ترکی کے ساتھ انصاف اور خود برطانیہ کے مفاد کا ذرا خیال نہ رکھے، تو صرف اس کا فلاں شخص حزب عمال کے لیڈروں سے کیوں ملا، مجھ سے کیوں نہ ملا، اس سے بھلا کسی بھلائی کی امید ہو سکتی ہے، باوجود ان بزرگ کے انکار کے مسٹر کلائنس اور مسٹر لینسبری نے صدر کانفرنس سے کہہ کر مجھے پانچ منٹ تو تقریر کے لئے دلا ہی دیئے، اور جس انداز سے میں نے تقریر کی، اس سے سامعین اتنا محظوظ ہوئے کہ صدر کی گھنٹی تین بار بجی مگر ہر بار سامعین چلا چلا کر کہتے رہے کہ ابھی اور تقریر کرنے دیجئے، انھیں نہ روکئے،

اس کے بعد مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہی ریمزے میکڈانلڈ صاحب وزیر اعظم ہوئے، لیکن ترکی کے ساتھ موصل کے مسئلے میں، مصر کے ساتھ سوڈان، سوئز اور دراز رسائل میں اور ہندوستان کے ساتھ گول میز کانفرنس کے مطالبے اور بنگال آرڈیننس کے معاملوں میں اس شخص نے جو کارروائی کی وہ قدامت پسند سے قدامت پسند اور استبدادی سے استبدادی آمریت کی کارروائی سے کسی طرح کم نہ تھی، جو ذاتی تجربہ خود مجھے اس کا ہو چکا تھا، اس کے بعد ان کارروائیوں نے مجھے یقین دلایا کہ یہ شخص اس آئینی کمیشن کے معاملے میں ہمارے خلاف جائیگا، اور جس طرح پہلے ترکی، مصر اور ہندوستان کے ساتھ اس نے مستبدانہ اور ناانصافانہ سلوک کیا ہے، اسی طرح پھر ہمارے ساتھ ویسا ہی سلوک ہونے دیگا، اور اس کی اور اس کی پارٹی کی کمک پر بھروسہ ہندوستانیوں کی سخت حماقت ہے" (ہمدرد ۲۹ نومبر ۱۹۲۶ء)

مولانا محمد علی نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے سائمن کمیشن کی سخت مخالفت کی، ان کا پیام تھا کہ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر سائمن کمیشن کی آمد کو ناکام بنا دیا تو ہمیشہ ہمیشہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمارا نام زرین حروف سے لکھا جائیگا، مسلم لیگ بھی مولانا محمد علی کی رائے کے ساتھ ہو گئی، لیکن پنجاب کے سر محمد شفیع مقاطعہ کے خلاف تھے، اس لئے انھوں نے مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر ایک علیحدہ لیگ قائم کی، جو "شفیع گروپ" کے نام سے موسوم ہوئی، حکومت کے پرستاروں کی کمی نہ تھی، اس لئے ہندو اور مسلمان دونوں میں ایسے افراد حاصل ہو گئے، جنھوں نے کمیشن کا ساتھ دیا، اس کی جا بجا دعوتیں بھی کیں، لیکن مجموعی حیثیت سے اس کا زبردست بائیکاٹ ہوا، جس کو حکومت نے بھی محسوس کیا،

پنڈت مدن موہن مالوی جی بھی اس کمیشن کے مخالف رہے، مدراس کانگریس میں انھوں نے اس کی مخالفت میں ایک پرزور تقریر کی، اور حکومت کی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی تشریح کرکے اپنی بے بسی کا اظہار کیا کہ ہم ہندوستانی کس طرح حکومت کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں، مولانا محمد علی کو یہ تقریر بے حد پسند آئی، گو وہ مالوی جی کی سیاسی راے سے ہمیشہ اختلاف کرتے رہے، مگر اس تقریر کو سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ بڑھ کر مالوی جی کے قدم چوم لئے اور جب خود تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو فرمایا کہ اگر مالوی جی نے اپنی سچی ذہنیت کا اظہار کیا ہے، تو حضرات! سائمن کمیشن آنے دیجئے، ہمیں اس کی پرواہ نہیں ہے، جس طرح مصر میں ملنر کمیشن سے کہدیا گیا تھا، کہ جو کچھ پوچھنا ہو سعد زاغلول پاشا سے پوچھو، اسی طرح ہم بھی کہہ دیں گے، کہ ہم کچھ نہیں چاہتے، اقلیتوں کے امین مالوی جی ہیں، جو کچھ ہو ان سے پوچھو" (سیرت محمد علی از رئیس احمد جعفری ص ۱۲۷) اسی طرح ان کو لالہ لاجپت راے کے خیالات سے بھی اتفاق نہیں رہا، لیکن مرکزی اسمبلی میں انھوں نے کمیشن کے خلاف جو تقریر کی، تو ان کو بہت پسند آئی، اور ہمدرد میں دل کھول کر اس کی تعریف کی، سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلہ میں لالہ لاجپت راے لاہور میں پولیس کے ہاتھوں ڈنڈے کھاکر سخت زخمی ہوگئے اور کچھ عرصہ کے بعد وفات پاگئے، محمد علی اس زمانہ میں یورپ گئے ہوئے تھے، واپس آئے تو اپنے سب سے پہلے بیان میں لالہ لاجپت راے کی وفات کو قابل رشک بتایا اور اپنے لئے تمنا کی کہ ایسی سعادت انھیں بھی حاصل ہوتی،"

(سیرت محمد علی ص ۱۲۶) (باقی)

ہندوستان میں مشرق وسطی سے متعلق

مطالعاتی ادارہ کا مقام

(ایک تجویز اور خاکہ)

از

جناب اے، اے، اے، فیضی صاحب

یہ مقالہ انگریزی میں دہلی کے رسالہ اسلامک اسٹڈیز میں شایع ہوا تھا، اس کا ترجمہ معارف میں پیش کیا جارہا ہے، مترجم محمد نعیم صدیقی، ایم اے رفیق دار المصنفین ہیں" معارف

لفظ "مشرق وسطی" (عربی میں "المشرق الاوسط") کو چند وجوہ کی بنا پر قابل اعتراض خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اولاً تو یہ اس دور کی یاد دلاتا ہے جب یورپ کی فوجی طاقت وہاں مسلط تھی، ثانیاً یہ لفظ بڑی حد تک ناموزوں بھی ہے، ثالثاً یہ کہ خود ہماری وزارت خارجہ نے اسے ترک کرکے "مغربی ایشیا" کہنا شروع کر دیا ہے، بہرحال زیر نظر مطالعہ کے لئے اسی لفظ کا استعمال مناسب ہوگا، کیونکہ تمام یورپی اور مشرقی زبانوں کی کتابوں اور جرائد میں اس لفظ کا استعمال اتنا عام ہے کہ اسکو ترک کر دینا ایک طرح کی خود نمائی ہوگی۔ لندن یونیورسٹی کے برنارڈ لیوس نے اس اصطلاح کے متعلق درج ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"الشرق الاوسط" کی اصطلاح ۱۹۰۲ء میں امریکی بحریہ کے مورخ
الفریڈ تھیر ماہن نے ایجاد کی تھی۔ اور اس سے مراد وہ پورا علاقہ تھا جو
ہند و عرب کے درمیان واقع ہے جس کا مرکز بحری اصطلاح میں خلیج
فارس ہو سکتا ہے، پھر اس جغرافیائی رقبہ کی اصطلاح کو "ٹائمس" اخبار اور
بعد میں حکومت برطانیہ نے بھی اپنا لیا، اس طرح مشرق وسطیٰ" اور اس سے
کچھ پہلے کے ایجاد کردہ "مشرق قریب" دونوں الفاظ عام طور پر استعمال
میں آنے لگے، یہ دونوں نام اس دور کی یادگار ہیں جب مغربی یورپ
کو دنیا کا مرکز تسلیم کیا جاتا تھا، اور دوسرے تمام علاقے اس کے اردگرد
سمجھے جاتے تھے، بہر حال یہ الفاظ سامراجی نظریہ کے حامل ہونے کے باوجود
اب بھی مقبول عوام ہیں اور روس ہندوستان اور افریقی ممالک
اس خط کو اسی نام سے پکارتے ہیں، یہ خط روس کے جنوب، افریقہ
کے شمال اور ہندوستان کے مغرب میں واقع ہے، خود مشرق وسطیٰ
کے عوام بھی اس لفظ پر متفق ہیں، کیونکہ عربی ادب میں اکثر "الشرق
الاوسط" کا ذکر ملتا ہے، یہ لفظ اتنا کارآمد ثابت ہوا کہ اس کا استعمال
خلیج فارس کے گرد و پیش کے تمام علاقوں میں وسیع پیمانے پر عام ہے
اور اب اس سے مراد وہ وسیع و عریض خطہ ہے جو بحر اسود سے افریقہ
کے خط استوا، اور ہندوستان سے بحر اطلانٹک تک پھیلا ہوا ہے۔
بہر حال مسلمان مورخین کو اس لفظ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا
کیونکہ اس کے ذریعہ وہ اس علاقے کو ان خطوں سے ممتاز کرتے ہیں جیسے ازمنہ وسطیٰ

کے اہل قلم "مغرب" کہا کرتے تھے اور اہل فرانس مغرب سے مراد شمالی افریقہ کا وہ علاقہ
لیتے تھے جو لیبیا سے مراکش تک محیط ہے، یہاں لفظ "وسطیٰ" کو مشرق قریب سے جدا
کرنے کے لئے ایک بات کی تصریح ضروری ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے مشرق قریب
پر مشتمل علاقوں یعنی یونان، بلغاریہ، ترکی اور مصر کو مشرق اوسط کے علاقوں عرب،
عراق، ایران اور افغانستان سے الگ سمجھا جاتا ہے[۱]

مگر یہ تفریق محض مصنوعی ہے کیونکہ اس سے ایک ایسے خطے کی تقسیم ہو جاتی ہے
جو سیاسی زندگی، معاشی جد وجہد اور مذہبی نظریات کے اعتبار سے ایک متحدہ علاقہ
کہا جا سکتا ہے، اس خطۂ ارض کی تاریخ بھی مشترک ہے اس لئے آئندہ صفحات میں ہم
اس لفظ کا استعمال اس کے وسیع پس منظر میں کریں گے، جس میں قدیم مصنفین کا
مشرق قریب کا اور جدید اصطلاح مشرق وسطیٰ دونوں شامل ہیں، اول الذکر سے
مراد وہ ممالک ہیں جو ہندوستان کے مشرق میں واقع ہیں، یعنی برما، تھائی لینڈ، ملائیشیا
اور انڈونیشیا، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ملیشیا اور انڈونیشیا کے علاوہ جہاں اسلام
غالب ہے اس مشرقی خط میں ہندوستانی تہذیب کا اثر گہرا ہے۔

اس طرح شرق اوسط مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا سنگم ہے، یہاں کے باشندوں
کے عقیدہ میں یہ خط تہذیب کا مرکز تھا، مشہور مورخ آرنلڈ ٹوائن بی کی بیان کردہ
اکیس[۲] مشہور تہذیبوں میں سے بارہ[۳] یا تو اسی خط میں پروان چڑھیں یا پھر دوسرے
علاقوں سے آکر یہاں ان کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا، مثلاً مصری تہذیب، کریٹ کا
قدیم تمدن سمیری تہذیب، شام بابل نینوا کا تمدن، ایرانی، عربی، یونانی اور مغربی
تہذیبوں کے نام لئے جا سکتے ہیں، دنیا کے تین بڑے مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت

اور اسلام کی ابتدا اسی خطہ میں ہوئی، اور یہ حقیقت بھی بڑی حد تک ثابت ہو
چکی ہے کہ جدید مغربی تمدن اسی درخت کا ایک ثمر ہے جو کبھی مشرق اوسط کے ممالک
میں اگا تھا۔

غرض مشرق وسطیٰ کے اطلاق سے مندرجہ ذیل خود مختار ممالک پر مشتمل علاقہ
ذہن میں آتا ہے۔

براعظم افریقہ: مراکش، الجزائر، سوڈان، تونسیہ، لیبیا، مصر۔

ایشیا: ترکی، سعودی عرب، یمن، حضرموت، منطقائی ریاستیں، عراق
شام، اردن، لبنان، ایران اور افغانستان۔

اس وسیع خطے کی تین اہم خصوصیات ہیں۔

۱۔ مذہب اسلام کا غلبہ

۲۔ عرب نسل کا شیوع

۳۔ عربی زبان کا وسیع استعمال۔

مذکورۂ بالا تمام ممالک میں اسلام مشترک مذہب ہے، عربوں کی تعداد تقریباً
دس کروڑ ہے، تین کروڑ کے لگ بھگ ترک اور اتنے ہی ایرانی ہیں، اس خطے میں
تین قسم کے مسلمان پائے جاتے ہیں، شمالی افریقہ کے مسلمان بیشتر مالکی المسلک ہیں، مصر
سوڈان میں حنفی اور شافعی مخلوط ہیں، سعودی عرب میں حنفی غالب ہیں، ترک زیادہ
تر حنفی ہیں لیکن ان کے قوانین سیکولر ہیں، کیونکہ انھوں نے مذہب اور سیاست کو
علیحدہ کر دیا ہے، یہ تمام اقوام راسخ العقیدہ اور سنی شریعت کے جدید تقاضوں کی
نمائندگی کرتی ہیں۔

ایرانیوں کی روایات الگ ہیں وہ نام نہاد طور پر اثنا عشری شیعہ عقاید پر قائم
ہیں لیکن موجودہ دور میں نئی نسل میں بڑی حد تک آزاد خیالی اور مارکسی نظریات
کا رجحان پایا جاتا ہے، مگر پرانی وضع کے لوگ اب بھی خاص طور پر نجف اور کربلائے
معلی کے علاقوں میں اپنے قدیم مسلک کے پابند ہیں، افغانستان اور ہند و پاک میں
حنفی مسلک رائج ہے، اس طرح مشرق وسطیٰ میں مذہب کے تینوں نظریات یعنی کٹر
سنی، تجدد پسند سنی اور ایرانی شیعہ موجود ہیں۔

بہت سے تاریخی، سیاسی اور معاشی اسباب کے باعث ہمیں مشرق وسطیٰ کے
ممالک کا غائر نظر سے مطالعہ کرنا چاہئے، عرب و ہند کے تعلقات کا سلسلہ ماقبل تاریخ
کے عہد سے ملتا ہے، مصر اور عرب میں پائی جانے والی بہت سی اشیا اس بات کا بین
ثبوت ہیں کہ ان ممالک میں تجارت کا سلسلہ تین ہزار سال قبل مسیح سے قائم تھا،
ہندوستانی جہاز جو معمولی بادبانوں اور بے شمار ملاحوں کے ذریعہ چلتے تھے، ہندوستانی
مال مثلاً گرم مسالے، موٹی روئی، ریشم، ململ اور جواہرات وغیرہ لے کر عرب اور
عراق جاتے تھے، اور وہاں سے سیب، پارچہ، جبہ، سونا، سیندور، کیوڑا اور زعفران
لے کر ہند آتے تھے، وادی سندھ یعنی موہنجوداڑو کے لوگ عربوں سے قریبی تعلقات رکھتے
تھے، ہندوستانیوں، مصریوں اور کریٹیوں کے درمیان تجارتی روابط پائے جاتے تھے،
عربی النسل گھوڑے ہرش وردھن کے دربار میں بہت مقبول تھے، اور ہندوستان
فولاد کی تلواروں کا ذکر عربی و فارسی ادب میں "ھندوانی" اور "المھند" کے نام سے
بکثرت ملتا ہے، ہندوستانی روئی کی ان ملکوں میں بہت مانگ تھی جسے عربی میں "قطن"
کہا جاتا تھا اور بعد میں یورپی زبانوں میں کاٹن (COTTON) کہا جانے لگا۔ ہندوستانی

تجار کی مستقل آمد و رفت سے دوسری صدی قبل مسیح میں شمالی افریقہ میں ایک ہندُستانی
نوآبادی قائم ہو گئی تھی، اور یہ تجارت آج بھی قائم ہے، دو سال قبل ساحل کوچین
پر راقم سطور کی ملاقات ایک عرب تاجر سے ہوئی اُس سے عربی میں گفتگو کرنے پر معلوم
ہوا کہ بحری تجارت اب مائل بہ زوال ہے، اس تاجر نے غلط فہمی سے میری ٹوٹی پھوٹی
عربی کو مصر کی مقامی زبان سمجھا اور اس نے قیاس کیا کہ میں مصر سے آیا ہوں۔

شامی مصنف زینوب (Zenob) کا بیان ہے کہ ہندوستانیوں نے وہاں
دو مندر بنائے تھے اور ان میں اپنے دیوتاؤں کے بت نصب کئے تھے، ایک جری
ہندوستانی ملاح کے بارے میں ایک مشہور واقعہ بھی منقول ہے کہ وہ کس طرح مصر
پہونچنے کی کوشش میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا اور منزل مقصود کے نزدیک نیم مُردہ
حالت میں پایا گیا۔ اسی ملاح نے مشہور حوصلہ مند یودوکسس (Eudoxus) کو ہندوستان
کا بحری سفر کرنے اور بحری تاریخ کا رخ موڑ دینے کی ہمت دلائی تھی، اس روایت
کی تاریخی حیثیت جو ہو لیکن یہ بات یقیناً کسی شک وشبہہ سے بالاتر ہے کہ ایک عرب
ملاح ہی نے واسکوڈی گاما کو آبنائے راس الامید سے ہوتے ہوئے ہندوستان کا
بحری راستہ دریافت کرنے میں مدد دی تھی۔ اور احمد بن ماجد بھی عرب ملاح ہی
تھا جس نے ۱۴۱۹ء میں مالندی (مشرقی افریقہ) سے کالی کٹ تک پہونچنے میں،
واسکوڈی گاما کی رہنمائی کی تھی۔

مذہب کے میدان میں بھی ہندوستان کے خود اپنے مبلغین تھے، جنکے ذریعہ زمانہ
قدیم میں بدھ مت مغربی ایشیا میں پہونچا۔ البیرونی (م ۱۰۴۸ء) نے شہنشاہ
اشوک کے اس دعوے کی تصدیق کی ہے کہ خراسان، ایران، عراق، موصل اور

شام کی سرحدوں تک بدھ مذہب پہونچ چکا تھا اور کافی حد تک ہندوستانی
تہذیب مشرق وسطیٰ میں اپنا اثر جما چکی تھی۔

دولت عباسیہ میں عربوں نے ہندوستان کے سائنسی ادب سے دلچسپی لینا
شروع کی جس طرح انھوں نے یونانی ادب کو ایشیائی سرزمین تک لانے میں اس
سے پہلے کیا تھا۔ ہندوستانی کہانیوں کے مشہور مجموعے "پنچ تنتر" کا عربی میں ترجمہ کیا
گیا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ "الف لیلہ ولیلہ" میں ہندوستانی کہانیاں بھی
موجود ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں اتنے انواع واقسام کے رنگ ہیں
کہ اس عہد کی دنیا کے ہر علاقے کا کچھ نہ کچھ اثر اس میں پایا جاتا ہے،

عیسائیت کے بارے میں بھی یہ روایت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہ وثوق کے
ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی میں ایک مشہور عیسائی مبلغ ٹامس جنوبی ہند
آیا تھا، اگرچہ اس روایت کی صحت میں تاریخی ثبوت کی کمی ہے تاہم بہت سے
ممتاز مورخین مثلاً جی ایم مورلیس وغیرہ اسکو صحیح تسلیم کرتے ہیں، مورلیس نے اپنی کتاب
"ہندوستان میں عیسائیت کی تاریخ" میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

علم طب کے میدان میں بھی عرب وہند کے باہمی تعلقات کی نمایاں جھلک ملتی
ہے۔ فارس کی مشہور یونیورسٹی جندیشاپور میں ہندوستانی ماہرین طبیعیات عرب
اور ایرانی رفقار کے ساتھ دوش بدوش کام کرتے تھے، ابتدائی عہد کے مشہور
ترین عرب اطبار مثلاً حنین بن اسحاق وغیرہ عیسائی تھے، آگے چل کر بہت سی
ہندوستانی کتابوں کے عربی میں ترجمہ کا ثبوت ملتا ہے، اسطرح علم طب یا قدیم
یونانی طرز علاج ہندوستان میں جم گیا اور بوعلی سینا کے اصول ہمارے ملک کی

طبی کتابوں کا اہم جزو بن گئے، دہلی کا ہمدرد دواخانہ یونانی علاج کا بہترین نمونہ ہے۔ یہاں کے فن دواسازی اور اطباء کی معالجاتی صلاحیت کا عصر جدید کے بہترین دواخانوں سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے، خصوصاً اگر اس طرز علاج کی ارزانی پر نظر ڈالی جائے تو یہ ہر قسم کی توصیف و تحسین سے بالاتر قرار پائیگا، آصف علی روڈ نئی دہلی میں ہمدرد نرسنگ ہوم اور کلینک جدید فن تعمیر کی عمدہ مثال اور بہترین آلات سرجری سے معمور ہے، اسی کے ساتھ وہاں قدیم طرز کا مگر نہایت موثر علاج بھی جاری ہے۔

اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ عربوں نے ہندوستان کو کیا دیا؟ میرا جواب یہ ہے کہ ہندوستان کو جمہوریت اور سوشلزم کا درس دینے میں یونانی عرب دنیا کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ایسی جمہوریت جس میں ایک عام شہری کو بھی اپنے ملک کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اسلام کے قانون وراثت نے بھی ہندوستان کو سوشلزم کا پیغام دیا، اس کے مطابق محض پہلی مرتبہ اولاد کو وراثت ملنے کا حق ختم ہوگیا۔ اسلام نے متوفی کی تمام اولاد کو (خواہ ذکور ہوں یا اناث) کچھ نہ کچھ وراثت ملنے کا حقدار قرار دیا ہے۔ یعنی لڑکوں کو دو حصے اور لڑکیوں کو ایک حصہ، اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا کانگریس کے رام گڈھ سیشن کو خطاب کرتے ہوئے جو الفاظ کہے تھے وہ بلا شبہہ آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

"ہم (یونانی اسلامی تہذیب کے نمائندے یعنی ہندوستانی مسلمان) ایک بیش بہا خزانہ اپنے ساتھ لائے، یہ سرزمین پہلے ہی خود اپنے بے شمار خزانوں

سے مالا مال تھی ہم نے اپنی دولت بھی اس ملک کے سپرد کر دی، اور ہندوستان نے اپنے سرچشمے سے ہم کو سیراب کیا۔ ہم نے اس ملک کو اپنے خزانہ کا ایک ایسا قیمتی تحفہ دیا ہے جس کی یہاں سخت ضرورت تھی یعنی جمہوریت اور مساوات کا سبق۔"

اب ہم سیاست اور ڈپلومیسی (حکمت عملی) کی طرف آتے ہیں، ہندوستان نے سیاسی میدان میں عرب ممالک کو ہمیشہ اپنا ہمنوا پایا ہے، جب اسرائیل کا تنازعہ پیدا ہوا اور گذشتہ عرب اسرائیل جنگ میں بھی ہندوستان نے عربوں کی پوری حمایت کی، گاندھی جی کے وقت سے لیکر اب تک ہندوستان نے دنیائے عرب کے قلب میں اسرائیل کی صیہونی توسیع پسندی کی کبھی حمایت نہیں کی۔ اور مسئلہ کشمیر میں عربوں نے ہمارا یہ قرض پورا پورا ادا بھی کر دیا۔ مرحوم صدر جمال عبد الناصر کی قیادت اور پاکستان سے مذہبی رشتے میں منسلک ہونے کے باوصف عرب ممالک نے ہمیشہ ایک غیر جانبدار رویہ اختیار کیا اور کشمیر کے متعلق وہ اپنے اس موقف پر شدت سے قائم رہے کہ یہ دو ایسے ہمسایہ ملکوں کے درمیان کا تنازعہ ہے جو خونی رشتوں اور معاشی فلاح وبہبود کی مشترک قدریں رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی پوری طرح معلوم ہے کہ عربوں کی اکثریت گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کا بے حد احترام کرتی ہے، اور وہ ہندوستان کو ایک ایسا عظیم ملک شمار کرتے ہیں جو سیکولر اور جمہوری اقدار کا علمبردار ہے، بہت سے عرب ممالک ہندوستان کی ناوابستگی کی پالیسی کے مداح ہیں۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ پختونستان کے مسئلہ کے باوجود جس میں کبھی ہند نے افغانستان پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔ افغانستان کا رویہ ہمارے ساتھ پاکستان کی بہ نسبت زیادہ دوستانہ رہا یقیناً اس کے

بہت سے سیاسی اور معاشی اسباب بھی ہو سکتے ہیں، مشرق اوسط کے صرف دو ملک ترکی اور
ایران ایسے ہیں جو ہمارے طرفدار نہیں ہیں، اسکا بڑا سبب ہماری ناوابستگی کی پالیسی ہے
اور یہ دونوں ملک امریکہ کے ساتھی اور دفاعی اور دوسرے معاہدوں میں اس سے
بندھے ہوئے ہیں، اس لئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہندوستان مشرق وسطی
کے دوست ممالک کے ثقافتی، تاریخی اور سیاسی مسائل کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرے،

ہمارے سامنے ایک دوسرا مسئلہ بین الاقوامی تعلقات کا بھی ہے، مشرق وسطی کے
تقریباً سبھی ممالک میں ہمارے سفراء، وزراء اور قونصل موجود ہیں، اس سلسلہ میں
سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمارے ایلچیوں کو ایسے لوگوں کا تعاون حاصل ہونا
چاہئے جو مشرق وسطی کی تین مختلف زبانوں یعنی عربی، فارسی اور ترکی میں کامل مہارت
رکھتے ہوں، کلاسیکی عربی سے ہم میں سے بہت کم لوگ واقف ہیں اور جدید فارسی
و ترکی میں بھی ہماری استعداد محض برائے نام ہے، ایسی صورت میں قاہرہ اور دمشق
کے بازاروں میں قرآن مجید اور معلقات (سبعہ معلقہ) کی زبان کے استعمال سے
کوئی فائدہ نہیں، ہمیں ایسے سفراء اور ان کے معاونین تیار کرنے چاہئیں جو روزمرہ کی
عربی (جسکو عرب دارجہ کہتے ہیں) جدید ترکی اور جدید فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے
ہوں۔ اس وقت ہمارے سامنے یہ سب سے اہم کام ہے اس کے بغیر مشرق وسطی میں
ہماری سفارتی کامیابی محض درجۂ دوم کی ہی ہو سکتی ہے،

اب ہم مسئلہ کے معاشی پہلو کی طرف آتے ہیں، مشرق اوسط کی بہترین معاشی
تاریخ کو لمبیا یونیورسٹی کے چارلس عیسوی نے لکھا ہے جو دنیا کے دوسرے حصوں کی
طرح اس خطۂ ارض کی تاریخ یعنی اس کی ابتداء، عروج اور زوال کی داستان سناتی ہے،

یہاں بارہویں صدی تک مسلم حکمرانوں کے عہد میں کافی ترقی ہوتی رہی، بارہویں سے
انیسویں صدی تک زوال کے آثار نمایاں رہے، گذشتہ دو صدیوں میں یوروپین
تجارت کی ترقی، وسائل کے استعمال اور بیرونی امداد کے ذریعہ بہت تیزی سے
حالات سدھرے ہیں اور روز بروز ان میں مزید ترقی ہوتی جارہی ہے۔ مشرق اوسط
ایک پھلتا پھولتا علاقہ ہے، وہ ہمیشہ سے بڑھتا رہا ہے اور مزید ترقی کے امکانات سے
بھرپور ہے، اس لئے اسکی سخت ضرورت ہے کہ ہندوستان مشرق وسطی کے ساتھ گہرا رابطہ
اور معاشی رشتہ قائم کرنے کی پوری کوشش کرے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس کے حالات بالکل واضح اور روشن ہیں، یہ ایک
ترقی پذیر ملک ہے، ہم نے صنعت کو قومی پالیسی کے طور پر اپنا لیا ہے۔ اس لئے یہ چیز ہمارے
لئے بڑی مفید ہوگی کہ ہم اپنا تیار شدہ مال دوسرے ممالک کو برآمد کریں اور وہاں سے
ستا خام مال اپنے ملک میں لائیں، ہم کو مغربی ملکوں سے کافی معاشی امداد اور فنی واقفیت
حاصل ہو رہی ہے، اس لئے ہم جو مال سستے داموں تیار کریں اس کو برآمد کرنے کے وسیع
ذرائع بھی پیدا کرنا ضروری ہیں۔ اس مقصد کے لئے مشرق وسطی ہماری بہترین منڈی
بن سکتا ہے، وہاں برآمدی تجارت کو فروغ دینے کی بڑی گنجائش ہے، راقم سطور نے
۱۹۶۲ء میں وزارت مالیات و تجارت سے اسکا پتہ لگانے کی کوشش کی کہ مشرق وسطی
کے ساتھ ہماری تجارت کی کیا حالت ہے، اور مجھے یہ جان کر سخت صدمہ ہوا کہ ۱۹۵۷ء
سے ۱۹۶۲ء تک کے پانچ برسوں کے دوران ہماری درآمد و برآمد دونوں بیس ۲۰ سے تیس ۳۰
فیصد تک گھٹ گئی ہے،

یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ پورے ہندوستان میں کوئی ایسا

ادارہ یا ایجنسی موجود نہیں جہاں سے تجارت کے متعلق صحیح اعداد و شمار اور دوسرے
معلومات حاصل ہو سکیں، کسی چیز کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیئے یا تو دہلی
وزارت کو لکھا جائے یا پلاننگ کمیشن کو، جبکہ انگلستان میں "ٹائمس" اخبار تمام عرب
ممالک کے بارے میں ہر قسم کی تفصیل مہیا کرتا ہے، اور باقی معلومات بھی بآسانی
دستیاب ہو جاتی ہیں، اب وقت آگیا ہے کہ ہمارے ملک میں یہ افسوسناک صورت
حال ختم ہو جانی چاہئے، میرا خیال ہے کہ ہمیں نہایت سنجیدگی کے ساتھ مشرق وسطیٰ کا
مطالعہ کرنا چاہیئے، یہ صحیح ہے کہ عرب ملکوں کو ہندوستان کا مطالعہ کرنے اور ہم سے
تعلقات استوار کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور ہند و شرق اوسط کے تعلقات
میں دو طرفہ سرد مہری پائی جاتی ہے پھر بھی کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس سلسلہ کی ابتدا اپنی
طرف سے کیوں نہ کریں۔

اس سلسلہ میں راقم سطور درج ذیل امور کو نہایت ضروری خیال کرتا ہے،

۱- شرق اوسط کی زبانوں کا سیکھنا

۲- اس خطہ کی جدید تاریخ کا علم

۳- وہاں کے معاشی حالات اور تیل کی صنعت سے نفع اندوزی،

۴- ثقافتی، سائنسی اور آثار قدیمہ سے متعلق مطالعہ۔

اس خطہ میں تین زبانیں بولی جاتی ہیں، عربی، فارسی اور ترکی، انھیں اکثر
"اسلام کی تین زبانیں" بھی کہا جاتا ہے، ان میں سب سے اہم عربی ہے، یہ مذہب اسلام،
اسکی شریعت، قوانین، تاریخ اور اس کے آدرشوں کی زبان ہے، اسلام کی صحیح
تاریخ کو سمجھنے کے لئے عربی بہترین وسیلہ ہے، یہ اٹھارہ ۱۸ ملکوں کی سرکاری اور دنیا

کروڑ عوام کی مقبول عام زبان ہے اور ادارہ اقوام متحدہ میں انگریزی، فرانسیسی،
ہسپانوی اور روسی زبان کے بعد پانچواں نمبر عربی ہی کا ہے، پانچ سو برس سے زیادہ
عرصہ تک تہذیب وسطیٰ کے دور میں بھی یہ عوامی زبان رہی ہے، عربی ہی وہ سرچشمہ
ہے جس سے جدید مغربی تہذیب سائنس اور فلسفہ وجود میں آیا، رومی اور یونانی تہذیبوں
اور جدید تہذیب کے درمیان رابطہ کا کام کرنے والی یہی زبان ہے، اگرچہ ہمیں
اسکا پورا احساس نہیں ہے لیکن عصر نو کی یہ ایک نہایت اہم زبان ہے جو مراکش
سے سعودی عرب اور عراق تک پھیلی ہوئی ہے میری رائے میں انگریزی اور روسی
زبانوں کے بعد ہندوستان میں ہمارے لئے یہی سب سے اہم بیرونی زبان ہے۔

عربی زبان کی تین بہت مشہور قسمیں ہیں، قدیم عربی، معیاری عربی، اور روزمرہ
کی بول چال والی عربی،

قدیم عربی ہمارے ملک میں وسیع پیمانے پر پڑھائی جاتی ہے، اس لئے اس کا تذکرہ
بیکار ہے، معیاری عربی سے وہ زبان مراد ہے جو شرق اوسط کے ریڈیو، اخبارات، فلم،
تھیٹر، یونیورسٹی، قانون سازی اور اہم کانفرنسوں میں استعمال کیجاتی ہے، اس سے
انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس زبان پر دو طرح کے اثرات غالب ہیں، ایک کلاسیکی
عربی کے اور دوسرے اس امر کا لحاظ کہ اس زبان کو ریڈیو اور سرکاری سطح کے
مذاکرات میں استعمال کے قابل بنایا جائے، دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ
معیاری عربی (فصحیٰ) کے قواعد قدیم عربی پر منحصر ہیں، لیکن اس میں جدید تقاضوں
کی گنجائش بھی پورے طور پر موجود ہے، چنانچہ اس میں یورپین زبانوں خصوصاً فرانسیسی
کے بہت سے الفاظ و محاورات دخیل ہو گئے ہیں۔

دنیائے عرب میں مغربی اثرات اس وقت داخل ہوئے جب ۱۸۹۷ء میں نپولین بوناپارٹ نے مصر پر فوج کشی کی تھی، یہی وہ زمانہ ہے جسے ہم عربی ادب کے دورِ جدید کی ابتدا کہہ سکتے ہیں، میں اسی جدید عربی کی اہمیت پر زور دینا چاہتا ہوں، محمد علی نے مصر کو جدیدیت کا رنگ دینے کی جو کوشش کی تھی اس میں فرانسیسی طور طریقے اور وہاں کے افکار و ثقافت پر کافی زور دیا گیا تھا، بہت سے مشاہداتی وفود فرانس بھیجے گئے اور مصر میں ایسے تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھی گئی جن کا طرزِ تدریس فرانسیسی تھا، وکلا، اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس جاتے تھے، اور مصر و لبنان میں فرنچ زبان کو وہی اہمیت حاصل ہو گئی تھی جو انگریزی کو ہندوستان کے مہذب طبقہ میں حاصل تھی اور آج بھی ہے ۱۹۴۹ء تک یعنی رئیس ناصر کے انقلاب سے پہلے اگرچہ فرانسیسی زبان کے اثرات گھٹ رہے تھے اور اس کی جگہ انگریزی (یہاں تک کہ امریکن انگریزی) لے رہی تھی، پھر بھی طٰہٰ حسین جیسے مصنف اور مفکر اور ضہوری جیسے قانوں داں فرنچ ہی کو فخریہ استعمال کرتے تھے کیونکہ ان کی تربیت فرانس میں ہوئی تھی، ان میں سے بعض کی بیویاں فرانسیسی تھیں اور ان کے ذہن اسلامی اور عربی اثرات کے باوجود مکمل طور پر فرانسیسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے،

مغربی زبانوں کے تراجم اور جدید خیالات کی ترجمانی کے لئے دوسری زبانوں کے بہت سے نئے الفاظ بھی استعمال میں لائے گئے لیکن ان بیرونی الفاظ اور افکار کا ردِعمل بھی ظاہر ہوا۔ اور متعدد ممتاز ادیبوں و نقادوں نے اس رجحان کی شدید مخالفت کی، فنی اصطلاحات کے وضع کرنے میں جب دشواریاں پیدا ہوئیں تو بعض مصنفین نے ان الفاظ و اصطلاحات کا بدل عربی میں تلاش کرنے میں بڑی محنت کی، فرانسیسی طرز کی عربی زبان کی سب سے پہلی سائنٹفک اکیڈمی کی بنیاد ۱۹۱۹ء میں دمشق میں رکھی گئی جس کا نام "المجمع العلمی العربی" ہے، اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں "عربی زبان کی شاہی مصری اکاڈمی" کا قیام عمل میں آیا جو آج "مجمع اللغۃ العربیۃ قاھرہ" کے نام سے مشہور ہے، عربی میں اب فرانسیسی اور انگریزی اثرات بہت نمایاں ہیں، وہاں کی موسیقی، ڈرامہ، نغمے، مصوری، فلم اور ریڈیو میں یورپ کے اثرات کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی کی حقیقی جھلک اور روزمرہ بول چال کی زبان کا عکس بدرجہ اتم موجود ہے۔

ریڈیو کی نشریات اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں، کہ مراکش سے عراق تک تمام عرب ملکوں میں ایک یکساں معیاری عربی لکھی اور بولی جاتی ہے، کلاسیکی عربی معیاری عربی کے طرزِ تحریر اور محاوراتی بول چال سے گو مختلف ہے لیکن وہ اب بھی نہایت مفید اور کارآمد ہے، یہ صحیح ہے کہ جدید عربی زبان کو قدیم عربی کے قواعد کے بغیر سمجھنا دشوار ہے لیکن یہ خیال یقیناً غلط ہے کہ سبعہ معلقات اور المتنبی کو سمجھنے والا طالب علم لازمی طور پر طٰہٰ حسین، خلیل جبران خلیل اور توفیق الحکیم کو بھی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، بیسویں صدی میں تغیرات کی برق رفتاری نے عربی زبان کے مختلف پہلوؤں پر کافی اثر ڈالا ہے، لہذا ہمارے لئے قدیم و جدید دونوں زبانوں کی واقفیت نہایت ضروری ہے، قدیم عربی کی مہارت سے جدید معیاری عربی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، فرانسیسی اور مغربی افکار و تصورات کو قبول کرنے کے لئے جدید عربی سے واقف ہونا لازمی ہے، شیخ محمد عبدہٗ جنھوں نے چوالیس ۴۴ سال کی عمر میں فرنچ میں کامل دسترس حاصل کر لی تھی، لکھتے ہیں،

کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے ملک کے اندر اپنے ملک کی خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تاوقتیکہ وہ ایک مغربی زبان نہ جانتا ہو۔

اس سلسلہ میں عوام کی روزمرہ کی عربی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ عامی زبان ہر ملک میں مختلف ہوتی ہے، یہاں تک کہ مختلف ضلعوں کی زبانوں میں فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق عربی میں بھی ہے، اس کی عوامی زبان میں عربی کے قواعد کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ روزمرہ کی بول چال کا فرق مراکش اور یمن سے شام تک یکساں نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم آج کے یونان میں ہومر کی زبان نہیں بول سکتے اور نہ موجودہ انگلینڈ میں ہم شیکسپیر یا مصدقہ ترجمہ والی بائبل (جو ۱۶۱۱ء میں کیا گیا) کی زبان کا استعمال کر سکتے ہیں، اس لئے ہمیں قاہرہ کے بازاروں میں معلقات اور المتنبی کو علیحدہ رکھکر عوامی سطح پر اترنا لازمی ہے۔

گذشتہ دس برسوں میں یورپ اور مشرق وسطیٰ دونوں جگہوں میں مقامی عربی کے مطالعہ کو کافی فروغ حاصل ہوا ہے، ماہرین لسانیات نے مقامی عربی کی بیس قسمیں دریافت کی ہیں مگر ایک عام ہندوستانی شہری کو کم از کم تین مقامی عربی زبانوں سے واقف ہونا چاہیے یعنی قاہرہ، دمشق اور مکہ معظمہ میں بولی جانے والی زبانیں مثلاً اس کا علم ضروری ہے کہ مصر میں قدیم عربی کا قاف عین سے بدل جاتا ہوا اور وہاں قہوہ کے بجائے عہوہ بولتے ہیں، خلیج فارس کے علاقوں میں وہی قاف جیم سے بدل جاتا ہے اور مقامی لوگ قاسم کے بجائے جاسم کہتے ہیں اور سوڈان میں وہی لفظ جاسم بن جاتا ہے، اخبار "المقطم" پورٹ سعید پر المعطم کہلاتا ہے جس کا

لہٰذا قدیم اور معیاری عربی کے ساتھ روزمرہ کی عامی زبان پر بھی توجہ دینا ضروری ہے تاکہ ہم وہاں کے عوام سے بآسانی گفتگو کر سکیں۔ جب میں مصر میں مامور تھا تو اگرچہ مجھے کلاسیکی عربی سے اچھی طرح واقفیت تھی اس کے باوجود قاہرہ کے ایک ادارہ میں میں نے عامی زبان سیکھی، اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ تھا، لوگ مجھے نحوی جیسے تحقیر آمیز لفظ سے یاد کرتے تھے کیونکہ میری فصیح عربی ہمیشہ مقامی زبان پر غالب آجاتی تھی۔

اسلام کی دوسری اہم زبان فارسی ہے۔ یہ ہندوستان میں وسیع پیمانے پر استعمال ہوتی تھی اس لئے اس کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، فارسی ایک آریائی اور ہند مغربی زبانوں میں سے ایک ہے، لسانیاتی حیثیت سے اس کا عربی سے کوئی تعلق نہیں جس کا سلسلہ نسب سامی زبانوں سے ملتا ہے اور فارسی کا رشتہ سنسکرت اور یونانی سے قائم ہے، کہا جاتا ہے کہ شاہ دارا خود ایرانی فارس نژاد تھا اور آرین قوم سے تعلق رکھتا تھا، زردشتی بھی اپنے کو آریائی نسل سے کہتے ہیں، جدید علماء نے فارسی زبان کو تاریخی اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ قدیم فارسی، عہد وسطیٰ کی فارسی، جدید فارسی، ایران کی قدیم زبانیں ...... وسطیٰ اور قدیم فارسی ہیں۔ زردتشت مذہب کی مقدس کتابیں قدیم ترین ایرانی زبان میں ہیں، اس کا اور ویدک کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے، جدید فارسی (جو پہلوی سے بدا لگا نہ ہے) وہ زبان ہے جس میں فارسی ادب کا ذخیرہ ہے تاریخی اعتبار سے یہ زبان اس پورے ادبی سرمایہ پر مشتمل ہے جو عربوں کی فتح کے بعد لکھا گیا۔ لیکن فارسی ادب صرف ایران تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ زبان تین دوسرے مرکزوں یعنی وسط ایشیا اور ہندوستان افغانستان تک پہونچ چکی ہے

سترہویں صدی تک ان تینوں مقامات پر پیدا ہونے والا فارسی ادب یکساں معیار کا تھا. لیکن گذشتہ دو صدیوں میں سماجی تغیرات اور سیاسی تبدیلیوں سے وہاں کی فارسی نظم ونثر ایک دوسرے سے کافی مختلف ہو چکی ہے۔ ہندوستان میں فارسی لکھنے اور بولنے کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے، صرف بمبئی کے مقیم چند ہزار ایرانی زرتشتی ہی شاید اب ہندوستانی، فارسی (یعنی دری) کا استعمال کرتے ہیں فارسی مضمون نگاری بھی نہ ہونے کے برابر ہے اور اب وہ محض اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھی پڑھائی جاتی ہے، لیکن افغانستان میں اب بھی سرکاری زبان ہے، مجھے ذاتی طور پر وہاں پیدا ہونے والے فارسی ادب کی ترقی کی رفتار اور اس کی قدر وقیمت کا کوئی علم نہیں ہے بہرحال ہم کو فارسی کے اصل مولد ایران کا مطالعہ کرنا اور یہ معلوم کرنا ہوگا کہ قدیم فارسی کی بہ نسبت اس میں کوئی ترقی ہوئی ہے یا نہیں۔

ہمارے ملک میں پڑھائی جانے والی فارسی زبان قطعی غیر حقیقت پسندانہ ہے، اس میں محض فردوسی سے جامی (یعنی دسویں پندرہویں صدی) تک کا مطالعہ شامل ہے اس دور کے متعلق بہت سی کتابیں انگریزی فرانسیسی اور فارسی میں موجود ہیں۔ زیر نظر مطالعہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دور جدید میں فارسی نظم ونثر میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

میں نے ایک بنیادی نظریہ کو یہاں پھر دہرایا ہوں کہ ماضی بلا شبہہ ایک عظیم سرمایہ ضرور ہوتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ تقاضائے وقت کی رعایت بھی ناگزیر ہے، اس لئے ہمیں موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جدید فارسی لکھنے، پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہئے اور جدید ایران کے عوام اپنے مافی الضمیر کو جس طرز سے ظاہر کرتے ہیں اسے بھی پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے،

اس مضمون میں گنجائش کم ہے اور مجھے ترکی زبان کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہے، اس لئے مختصراً فارسی سے دلچسپی رکھنے والوں کو یہ مشورہ دونگا کہ وہ اس موضوع پر مزید واقفیت حاصل کرنے کے لئے ایک جدید ایرانی مصنف برتلز کا مطالعہ کریں، صرف جامی پر فارسی مطالعہ کو ختم کر دینا بڑی فاش غلطی ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ہم انگریزی ادب کا مطالعہ صرف ایلزبتھ اول کے عہد تک یا عربی کا مطالعہ صرف عہد بنی امیہ تک اور فرانسیسی کا مطالعہ صرف ریسین (Racine) تک کریں. ادب کے سدا بہار سرچشمہ میں کوئی بھی مصنوعی رکاوٹ پیدا کرنا نادانی ہے۔ فکر انسانی کا دریا ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے اور انسانی ذہن اپنے خیالات کی ترجمانی کے لئے نت نئے طرز اور پیرایے اختیار کرتا رہتا ہے، چنانچہ اردو کی ترقی پسند تحریک کی طرح جدید ایران میں بھی قومی اور مارکسی شاعری کا عنصر غالب ہے،

اسلام کی تیسری اہم زبان ترکی ہے، عرصۂ دراز تک وہ عربی کے ایک ترمیم شدہ رسم الخط میں لکھی جاتی رہی لیکن اسکا عربی اور فارسی سے کوئی تعلق نہیں ہے. لسانیاتی اعتبار سے وہ وسط ایشیا کی زبانوں میں سے ایک ہے، یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ مغل حکمرانوں کی مادری زبان اگرچہ ترکی تھی مگر وہ ہندوستان میں کبھی رائج نہیں ہوئی، دربار دہلی کی زبان فارسی تھی اور اسی کو یہاں عام مقبولیت حاصل رہی. یہاں تک کہ آج ہمارے ملک میں ترکی زبان کا مطالعہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے، ہندوستان میں شاید ہی کسی یونیورسٹی میں اعلیٰ پیمانے پر ترکی پڑھانے کا انتظام ہو. اس لئے اس خلا کو پر کرنے کی بہت سخت ضرورت ہے،

لفظ ترک کا وجود (جسے چینی زبان میں "توکو" کہتے ہیں) سب سے پہلے پانچویں صدی میں ایک خانہ بدوش قبیلہ کے نام کے طور پر ملتا ہے، اس صدی میں ترکوں نے ایک وسیع سلطنت کی بنیاد ڈالی جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی، روسی، ترکی اور جرمن اہل علم نے ترکی عوام کی تاریخ کے بارے میں قابل قدر تحقیقات کی ہیں لیکن یہاں اس پر بحث کرنے کی بالکل گنجائش نہیں، خلافت عثمانیہ کے ذکر سے پہلے ایک اہم حقیقت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ مسلمانوں کے ترکی فتح کرنے اور ترکوں کے اسلام قبول کرنے میں کوئی تعلق نہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ "انھیں اس وقت تک سکون سے رہنے دو جب تک وہ تمھارے سکون میں خلل انداز نہ ہوں"، ترک بلاشبہہ نہایت جری اور ناقابل تسخیر قوم تھی جو خود برضا و رغبت اسلام کی حلقہ بگوش ہوئی ترکی کے تین کروڑ باشندوں کے علاوہ روس میں بھی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ترک موجود ہیں۔

آٹھویں اور نویں صدی عیسوی تک ترکی زبان کے ابتدائی حروف تہجی آج سے قطعی مختلف تھے، جو سامی زبان کے رسم الخط کا چربہ تھے، دسویں اور گیارہویں صدی میں ترکوں کے اسلام قبول کرنے پر وہاں عربی حروفِ تہجی رائج ہوئے، یہ سلسلہ بیسویں صدی تک چلتا رہا، لیکن کمال اتاترک کی اصلاحات کے بعد رومن حروف تہجی کی ایک ترمیم شدہ شکل اختیار کی گئی۔

ترکی زبان کی اس ابتدائی تاریخ سے قطع نظر اب ہم دولت عثمانیہ کے ترکی کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ عثمانیوں کی زبان (جو عرف عام میں عثمانلی کہلاتی ہے) پندرہویں صدی تک تاریخ، سائنس اور ادب میں برابر استعمال ہوتی اور دولت عثمانیہ کے عروج

لطف ... کا ماخذ معلوم نہیں کیا ہے؟ م

کے ساتھ ساتھ یہ زبان بھی ترقی کرتی رہی، گذشتہ چار صدیوں میں اسکا شمار اسلام کی تین اہم زبانوں (بشمول، فارسی و عربی) میں ہونے لگا۔ اور آج بھی رومن رسم الخط اختیار کر لینے کے بعد جدید اسلام کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ زبان نہایت اہم سمجھی جاتی ہے۔

معاصر عثمانی ترکی دراصل ترکمانی (زبانوں کا مجموعہ) کی ایک شاخ ہے۔ اسکا معیار وہ زبان تھی جو سابق قسطنطنیہ اور موجودہ استنبول میں استعمال کی جاتی رہی ہے یعنی الفاظ کو مخفف اور شیریں بنا دیا جاتا ہے، مثلاً خانم کا تلفظ ہانم ہو جاتا اور محمد کے بجائے محمت بولا جاتا ہے، اسی طرح اور بھی مثالیں ہیں۔

اس لئے ظاہر ہے کہ ترکی زبان کی تاریخ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ہمیں مشرق وسطیٰ کے درس و مطالعہ کے کسی اچھے ادارہ میں رہ کر دونوں ہی رسم الخط کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ یہاں ہم ان ابتدائی صدیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جب وہاں کی شاعری پر فارسی زبان کا اثر غالب تھا اور کمال اتاترک کے بعد کے عہد میں آتے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ کمال اتاترک کی اصلاحات نے ترکی میں وہی انقلاب پیدا کیا ہے جیسا محمد دوم کی فتح قسطنطنیہ کے بعد پیدا ہوا تھا، مثلاً تمام مقاصد کیلئے لاطینی حروف کو اختیار کیا گیا، ایک ممتاز نقاد کاپرلوزادہ فواد (Koprulu Zade - Fuad) نے اپنی عالمانہ تحقیقات میں واضح کیا ہے کہ ادب شاعری، سائنس اور فنون لطیفہ سب پر قومی تحریک کا اثر پڑا ہے، زبان کو بہت ہی آسان بنا دیا گیا ہے اور ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کے نظریہ کو اپنا لیا گیا ہے، علم نجات سائنس، تاریخ اور جدید ادبی موضوعات نے بہت ترقی کی ہے، مثلاً انقرہ یونیورسٹی کی مطبوعات کا مقابلہ بعض یورپی یونیورسٹیوں کی مطبوعات سے پوری طرح کیا جا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شیخ الاسلام حسام الدین ابو المحامد حامد العاصی نے عربی زبان
میں بہت سی دینی کتابیں اور اسلام کی تینوں زبانوں میں نظمیں بھی لکھی ہیں ان کی عربی
نظمیں فصیح، فارسی کی لطیف و شیریں اُن کی ترکی شاعری شستہ و رفتہ ہے، کیمبرج یونیورسٹی
میں میرے استاد پروفیسر ایڈورڈ براؤن عربی، فارسی اور ترکی آسانی سے بول لیتے
تھے اور مجھے قوی امید ہے کہ جلد یا بدیر ہندوستان بھی ایسے ممتاز لوگ پیدا کرنے کے
قابل ہو جائیگا۔

مذکورہ بالا سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ شرق اوسط
کو سمجھنے کے لئے وہاں کے تاریخی اور معاشی حالات کا مطالعہ بے حد ضروری ہے انگریزی
کے علاوہ بہت سی یورپی زبانوں میں ان سے متعلق کتابیں موجود ہیں، مشرق وسطی
میں تیل اور معدنیات کا بڑا ذخیرہ ہے، مغربی طاقتیں تیل کے وسائل کا استعمال
کرکے ان غیر ترقی یافتہ اور نسبتاً غریب ممالک کو بے انتہا دولت سے مالا مال کر رہی
ہیں اس دولت کو عرب ریاستیں تعلیم، صحت اور تعمیرات کی ترقی پر خرچ کرنا
چاہتی ہیں، انھیں لائق اساتذہ، ڈاکٹروں، انجنیروں اور ٹیکنیکی ماہرین کی بڑی
ضرورت ہے، اگر ہمیں اس علاقے کی زبانوں سے واقفیت اور ان کے عوام کے
حالات زندگی کا پورا تجربہ ہو تو ان کی نشأۃ ثانیہ کا کام بہت حد تک آسان ہو
ہو سکتا ہے، اور ہمارے نوجوانوں کو روزگار کے مواقع بھی فراہم ہو سکتے ہیں۔

ہم نے مشرق وسطی سے متعلق ایک مطالعاتی ادارہ کے لئے ایک اجمالی تجرباتی خاکہ
تیار کیا ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

مقاصد ۱- جدید عربی، جدید فارسی، جدید ترکی اور اس کے بعد پشتو، کرد، آرمینیائی،

جارجیائی اور دوسری زبانوں کا پورا مطالعہ جس میں ان زبانوں کی جدید
روزمرہ اور تحریر میں استعمال ہونے والی معیاری شکلیں شامل ہوں۔

۲- فصیح عربی، قدیم فارسی اور کلاسیکی ترکی کے مبادیات کی واقفیت پیدا کرنا۔

۳- اٹھارہویں صدی سے عہد حاضر تک کی مشرق وسطی کی تاریخ کا مطالعہ

۴- کاروبار، تجارت اور معاشیات سے متعلق مطالعے جس میں تیل کے وسائل
ان کی تقسیم و فروخت سب شامل ہوں۔

۵- زراعت، بنجر زمینوں کو زیر کاشت لانا اور جنگلات اگانا۔

۶- ثقافتی مطالعے جس میں سماجیات، قانونی اصطلاحات علم الانسان اور
آثار قدیمہ کا علم شامل ہوں۔

۷- اس ادارہ کی ترقی کے بعد اس میں فلسفہ، مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ
فنون لطیفہ، فن تعمیرات، موسیقی، سائنس اور دوسرے مضامین کو بھی شامل
کر لیا جائے۔

اسناد ۱- اس ادارہ سے فارغ التحصیل ہونے والے ان طلبہ کو جو ہائی اسکول
پاس نہ ہوں اس خطے میں بولی جانے والی زبان میں مہارت کا سرٹیفکیٹ
دیا جائے، یہ ایک سال کا تربیتی نصاب تحریری نیز بولی جانے والی عربی
فارسی اور ترکی کی ابتدائی واقفیت پر مبنی ہوگا۔

۲- ان تینوں زبانوں میں سے کسی ایک کی مہارت کا ڈپلوما ان طلبہ کو دیا جائے
جو انٹرمیجیٹ سائنس یا آرٹ میں پڑھ رہے ہوں۔ یہ دو سال کا تربیتی کورس
ہوگا۔ یہ نصاب ایک زبان کی کامل مہارت، دوسری زبان کی ابتدائی واقفیت

اور اٹھارہویں صدی سے اب تک کی سیاسی تاریخ کے مبادیات پر مشتمل ہوگا۔

۴۔ تین سال کا کورس پورا کرنے والے کو ڈگری دی جائے گی۔ اسکا نصاب تعلیم مندرجہ ذیل ہوگا۔

لازمی مضامین

۱۔ کلاسیکی عربی کی اچھی صلاحیت (جو انٹر میجیٹ کے معیار کی ہوگی)

۲۔ جدید عربی، فارسی اور ترکی میں سے کسی ایک کی کافی استعداد

۳۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی سیاسی تاریخ جو انگریزی اور خصوصاً فرانسیسی ذرائع سے حاصل کی گئی ہو۔

اختیاری مضامین

مندرجہ ذیل مضامین میں سے کسی ایک کی خصوصی مہارت۔

(الف) تجارتی تعلقات، کاروبار اور تیل کے وسائل کا استعمال

(ب) زراعت، ریگستان کی آبادکاری اور جنگلات اگانا۔

(ج) اس خطے کے سامی النسل قبائل کی جغرافیائی تقسیم، اسلام کے مختلف فرقوں مثلاً دروزیوں، علویوں اور مشرق اوسط کے دوسرے فرقوں کا علم، پیدائش و وفات کے اعداد و شمار اور مختلف قبائل کے باہمی تعلقات۔

(د) قانونی اصطلاحات، سماجی ارتقاء اور عرب قومیت کا تصور۔

(ھ) جدید عربی ادب میں مکمل دستگاہ۔ خصوصاً طہ حسین، منفلوطی، عباس محمود العقاد اور توفیق الحکیم جیسے مصنفین کا مطالعہ، جدید عربی شاعری میں دسترس، معیاری عربی میں مضامین و مقالات لکھنے اور تقریریں کرنے کی سہولت اور بعد میں یہی مہارت

فارسی اور ترکی میں بھی پیدا کی جائے۔

اس کے بعد جیسے جیسے لائق اساتذہ کا انتظام ہوتا جائے دوسرے مضامین مثلاً فلسفہ قانون، فنون لطیفہ، موسیقی اور فن تعمیر کو بھی شامل نصاب کر لیا جائے۔

لائبریری یہ بہت ضروری چیز ہے اس میں نہ صرف جدید عربی، فارسی اور ترکی کی کتابوں بلکہ جرمن، فرانسیسی، انگریزی، اسپینی اور روسی کتب و جرائد کا ہونا بھی لازمی ہے، ساتھ ہی کل ہند پیمانے پر ایک باصلاحیت اور تربیت یافتہ لائبریرین کا ہونا بھی ضروری ہے۔

عملہ شرائط: جدید عربی، فارسی اور ترکی کی مہارت رکھنے والے لائق اساتذہ بہت ہی کم ہیں، اس لئے کسی استاذ کو اس وقت تک اسٹاف میں منتقل نہ کیا جائے جب تک کہ وہ ان تینوں زبانوں کے علاوہ فرانسیسی میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل نہ کرلے، تم چہ جائیکہ وہ اسپینی، روسی اور جرمن زبانوں میں سے بھی ایک جانتا ہو۔

ریسرچ امریکہ اور افریقہ کی یونیورسٹیوں میں مشرق وسطیٰ سے متعلق اداروں کی تعداد روز بروز تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے، مندرجۂ بالا لیاقت کے آدمیوں کی وہاں سخت ضرورت ہے، لیکن جب تک مشاہروں کا گریڈ معقول نہ ہوگا یہ ادارہ کوئی خاص ترقی نہیں کرسکیگا، صرف ایک امریکہ میں ایسے اداروں کی تعداد ۲۸ ہے جو مشرق وسطیٰ کے متعلق معلوماتی کورس فراہم کرتے ہیں۔

آیۂ ”واورثنا بنی اسرائیل“

پر ایک نظر

از جناب مولانا محمد شفیع صاحب فرنگی محلی

(۲)

بہرحال ”موسیٰ ومن معہ“ ارض مصر سے چلے گئے ہوں یا ”اسکنوا فی الارض“ کے حکم کے ماتحت مصر ہی میں رہے ہوں، تو ایسا ہو سکتا ہے کہ پہلی صورت میں بقیہ بنی اسرائیل کو جو ”مومن لموسیٰ“ نہ تھے، یا یوں کہا جائے کہ جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ نہ تھے اور دوسری صورت میں کل بنی اسرائیل کو وہ ”جنٰت وعیون وکنوز اور مقام کریم“ مل گئے ہوں جن کی وراثت کا ذکر سورۂ شعراء کی آیت میں ہوا اور ”تنعا بنی اسرائیل“ کے الفاظ سے ہوا اور ”مشارق الارض اور مغارب ارض“ کے وہ وارث بن گئے ہوں، جیساکہ سورۂ اعراف میں ہے (آیہ اوپر مذکور ہو چکا ہے) اور ”تمکن فی الارض“ کے جس ارادۂ الٰہیہ کا ذکر سورۂ قصص میں ہے، بنی اسرائیل کے حق میں جو ارض مصر میں ”مستضعفین“ تھے، اس کا ظہور ہو گیا ہو، سورۂ قصص میں ہے،

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا	اور ہم ارادہ کرتے تھے کہ زمین (مصر) میں
فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم	جو لوگ کمزور اور حقیر سمجھے جاتے تھے (اور
الوارثین ونمکن لھم فی الارض و	انکا زور گھٹایا جا رہا تھا) ان پر احسان
نری فرعون وھامان وجنودھما	کریں اور انکو پیشوا بنا دیں اور انکو (ملک کا)
منھم ما کانوا یحذرون ،	مالک بنا دیں اور زمین میں با اقتدار کر دیں

اور فرعون اور ہامان اور انکے لشکروں کو وہ دکھا دیں کہ جس کا ان کی طرف سے (کمزور اور حقیر سمجھے جانے والوں کی طرف سے) انکو خطرہ تھا اور اسی سے وہ بچنا چاہتے تھے،

اور سب بنی اسرائیل (نہ کہ صرف موسیٰ ومن معہ) ”مستضعفین“ تھے اور سرزمین فرعون ہی کے (ارض مصر کے) ”مستضعفین“ تھے، سورۂ قصص کی مذکورہ آیت کے پہلے یہ آیت ہے،

ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا	یقیناً فرعون زمین میں (سرزمین مصر میں)
شیعا یستضعف طائفۃ منھم	بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور ڈینگیں مارا
یذبح ابناءھم ویستحیی	کرتا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں
نساءھم انہ کان من المفسدین	مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا تھا ان میں
	سے ایک گروہ کو بہت کمزور اور حقیر
	کر دینا چاہتا تھا، اور انکا زور گھٹانا
	چاہتا تھا، اس طرح کہ انکے بیٹوں کو

اور ظاہر ہے کہ یہ بنی اسرائیل ہی تھے کہ جن کے بیٹوں اور عورتوں کے ساتھ فرعون نے آیت بالا میں مذکورہ طریقہ کار اختیار کر رکھا تھا (اسکا ذکر قرآن کی کئی آیتوں میں ہے)

تو جس سرزمین میں یہ ”مستضعف“ تھے، اسی سرزمین پر ان کا ”تمکن“ اور اسی سرزمین کی ”وراثت“، ظاہر قرآن کے بالکل موافق ہے، فرعون حضرت موسیٰؑ کے مطالبات کے متعلق یہی تو خیال کرتے تھے، کہ یہ محض اقتدار حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اور ان کو اندیشہ تھا کہ ارض مصر پر یہ اقتدار حاصل کر لیں گے جس سے وہ بچنا چاہتے تھے، (جیساکہ اوپر

ستضعفین کو حاصل ہونا ماننا چاہیے، ورنہ ارادہ الٰہیہ ہو چکا ہے) تو وہی ارضِ مصر پر اقتدار ان مستضعفین کو حاصل ہونا ماننا چاہیے، ورنہ ارادہ الٰہیہ

"و نری فرعون و ھامان وجنود ھما منھم ما کانوا یحذرون" (اور فرعون و ہامان

اور ان کے لشکروں کو وہ دکھا دیں کہ جن کا ان کی طرف سے ان کو خطرہ تھا، اور اس سے

وہ بچنا چاہتے تھے) کا ظہور کیسے ہوتا، ارض شام و فلسطین وغیرہ پر "تمکن"، اور ارض شام

و فلسطین وغیرہ کی وراثت سے فرعونیوں کا کیا تعلق ہے؟ (بعض حضرات ارض شام و فلسطین

وغیرہ کی وراثت قرار دیتے ہیں)

اگر واقعہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ "موسیٰ و من معہ" نے غرقِ فرعون کے بعد مصر کو چھوڑ

دیا تھا، بقیہ بنی اسرائیل مصر ہی میں رہے، تو "نجعلھم ائمۃ و نجعلھم الوارثین"

(ان کو پیشوا بنا دیں اور ان کو ملک کا مالک بنا دیں، اور زمین میں ان کو با اقتدار کر دیں)

کا ظہور یوں مانا جا سکتا ہے، کہ "مستضعفین" میں سے "موسیٰ و من معہ" کو امامت اور پیشوائی کا

منصب حاصل ہوا اور بقیہ "مستضعفین" (بقیہ بنی اسرائیل) کو "وراثت ارض" (سرزمین

مصر کی وراثت) حاصل ہوئی جبکہ "مستضعفین" میں یہ سب داخل تھے، اور ارادۂ الٰہیہ

کا تعلق انہی کے ساتھ بتایا گیا ہے، سورۂ دخان میں ہے،

کم ترکوا من جنٰت و عیون و	اور فرعونی لوگ کتنے ہی باغ اور چشمے
زروع و مقام کریم و	(یعنی نہریں) اور کھیت اور عمدہ مکان
نعمۃ کانوا فیھا فاکھین	اور آرام کے سامان جس میں وہ خوش
کذٰلک و اورثنٰھا قوما	رہا کرتے تھے چھوڑ گئے "اسی طرح ہوا"
آخرین فما بکت علیھم	اور ہم نے ایک دوسری قوم کو انکا وارث
السماء و الارض و ما	اور مالک بنا دیا نہ تو ان پر آسمان اور زمین کو

کانوا منظرین ○

رونا آیا اور نہ انکو مہلت دی گئی،

اس آیہ میں اگر "قوما آخرین" (دوسری قوم) سے مراد بنی اسرائیل ہیں، جیسا کہ اکثر

مفسرین کا خیال ہے تو معاملہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ یہاں "ترکوا"، کے بعد وراثت

کا ذکر ہے اور "وراثتِ متروکہ" کا تحقق اسی وقت ہوتا ہے، کہ جو چیز متروکہ ہو وہی دوسرے

کو صلے میں ملی ہوئی ہو، یہ نہیں کہ متروکہ ہو ایک مال اور ملے دوسرا مال، اور معاملہ زیر بحث

میں "متروکہ"، مصر کے جنٰت و عیون وغیرہ ہیں، تو بھی مصری باغات اور عیون وغیرہ بنی اسرائیل

کو ملنا متصور ہوتا ہے نہ یہ کہ متروکہ تو مصری باغات وغیرہ ہوں اور ملے ہوں شام و فلسطین

وغیرہ کے باغات وغیرہ، مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے ترجمان القرآن جلد دوم میں

(سورۂ اعراف کی ایک آیت کے تشریحی نوٹ میں جس کا ذکر آگے آئیگا) تحریر فرمایا ہے کہ شام

فلسطین وغیرہ فرعون کی خراجی اراضی تھی، اگر "خراج فرعون" اور اس "وراثت بنی اسرائیل" کے سلسلہ

میں بھی اسی کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ عجیب و غریب منظر ہوگا، کہ فرعونیوں سے نجات پانے

کے بعد پھر فرعونیوں ہی کی زمینوں کی جانب حضرت "موسیٰ و من معہ" گئے ہوں، تفسیر ماجدی

میں "واورثنٰھا بنی اسرائیل"، کے سلسلہ میں یہ عبارت ہے،

"ھا کی ضمیر مطلق باغوں اور چشموں وغیرہ کی جانب ہے، خاص مصر ہی کے باغ اور چشمے

مراد لئے جائیں، جب بھی حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں مصر کے علاقے دار السلطنت میں

شامل ہو گئے تھے، اور یرمیاہ نبی کے زمانہ میں مصر یہود کا وطن از سر نو بن گیا تھا"،

اور سورۂ قصص کی آیہ "و نجعلھم الوارثین" کے سلسلہ میں یہ عبارت ہے،

"اس مشیت (و نرید ان نمن الخ) کا ظہور یوں ہوا کہ فرعون کی غلامی سے آزادی

نصیب ہوئی، اور آگے چل کر شام و فلسطین کی حکومت مل گئی"!

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خاص مذکورہ جنت وعیون وغیرہ کی جانب ضمیر کیوں نہ مانی جائے
جبکہ ظاہری بات ہے، جواب میں سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے، کہ تاریخ مصر میں اس کا
پتہ نہیں چلتا، لیکن تاریخ مصر میں تو سرے سے فرعون موسیٰ و غرق فرعون وغیرہ کا بھی
پتہ نہیں چلتا، صرف مذہبی روایتوں میں ان کا ذکر ہے، اس لئے مانا جاتا ہے، بظاہر قرآن
سے وراثت بنی اسرائیل کا جو حال معلوم ہوتا ہے، اسے کیوں نہ تسلیم کیا جائے اور ظاہر سے
عدول کی کیا وجہ قرار دی جا سکتی ہے اور یہ ظاہر قرآن کی توجیہ میں حضرت سلیمانؑ اور یرمیاہ
نبی کے زمانہ کا جو حوالہ دیا گیا ہے تو یہ کہنا تو ویسا ہی ہوا کہ جیسے کہا جائے کہ مغل حکومت ختم
کرکے اللہ تعالیٰ نے اس کی قائم مقام اور وارث موجودہ بھارتی کی حکومت کو کر دیا یا یہ کہا جائے
کہ اشوک شاہی حکومت کی تباہی کے بعد اس کی قائم مقام اور اس کی وارث اللہ تعالیٰ نے انگریزی
حکومت کو کر دیا ومثلہٗ بہرحال یہ بھی ایک تاویل ہے، جبکہ اس کی ضرورت نہیں، بغیر اس کے
بھی کام چل سکتا ہے، کما مرّ اور سورۂ قصص والی آیۃ کے سلسلہ میں جو کچھ تحریر ہوا ہے، وہ کیسے
قابل اعتنا مانا جائے، کیونکہ آگے چل کر وہ فلسطین کی حکومت مل گئی، والا قول آیہ ونُری
فرعون وھامان وجنودھما منھم ما کانوا یحذرون کے مناسب نظر نہیں آتا کما مر،
یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ میرے عزیز محترم بزرگ کی نظر سے لفظ "ترک"، "وراثت" "استخلاف"
کے عمومی استعمالات نہ گذرے ہوں گے اور خصوصی استعمال قرار دینے کے لئے قرائن کی ضرورت
نہ محسوس فرماتے ہوں بظاہر مولانا موصوف ... کی اس تحریر کو ایک تاویل ہی کہا جا سکتا
ہے جس میں وہ منفرد نہیں ہیں لیکن اس تاویل ... کی کوئی ضرورت نہیں، بغیر اس کے بھی
کام چل سکتا ہے؛

اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ اس صورت میں ... تھا کہ سورۂ دخان کی آیۃ مذکورہ میں "قوماً آخرین"

سے مراد بنی اسرائیل ہوں، لیکن ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل مراد نہ ہوں بلکہ ہکسوسی حکومت
اور اس کے آثار کو بالکلیہ تباہ کرنے والے فراعنۂ مصر ہوں، جو نسلاً ہکسوسی نہ تھے قبطی النسل تھے جن سے
قبطی النسل شاہنشاہی کا جدید دور شروع ہوا، ان قبطی النسل فراعنہ نے ہکسوسی زمانہ کے تمام
آثار ملیامیٹ کر دیئے تھے اسلئے ہم کو ابراہیمؑ و یعقوبؑ و یوسفؑ و موسیٰ علیہم السلام اور غرق فرعون کے
متعلق مصری آثار میں کچھ نہیں ملتا اور غالباً اسی جانب قرآن نے "فما بکت علیھم السماء والارض"
سے اشارہ کیا ہو، اور کیا عجب ہے کہ انہی قبطی النسل فراعنہ کی شاہنشاہی میں مصر سے بنی اسرائیل
کا مکمل اخراج ہوا ہے، کیونکہ بنی اسرائیل ہکسوسی جنت وعیون وغیرہ پر قابض ہو گئے تھے، یہ
قبضہ عارضی تھا، اس لئے سورۂ شعراء میں صرف "واخرجناھم" کہہ کر وراثت بنی اسرائیل
کا ذکر کر دیا گیا ہے، اور قبطی النسل فراعنہ کی وراثت کے بیان میں "ترکوا" والے لفظ کے بعد وراثۃ
"قوماً آخرین" کا ذکر ہے، کیونکہ یہ "وراثۃ" بطور مستقل تملیک کے تھی، اور بنی اسرائیل کی وراثۃ عارضی
اور قابضانہ اور دونوں جگہ "وراثت" کے پہلے "کذالک" کے اضافہ سے شاید اشارہ اس جانب ہو
کہ یہ وراثت فوری واقع نہیں ہوئی تھی، تدریجی طریقہ سے ہوئی اور اس میں وقت لگا، بنا بریں
یہودی روایتوں میں غرق فرعون کے بعد بنی اسرائیل کے مصر سے جس خروج کا ذکر ہے، وہ
اصل میں قبطی النسل فراعنہ کے اخراج والا خروج ہے، نہ کہ غرق فرعون کے بعد تمام بنی اسرائیل
کا مصر سے خروج، ڈاکٹر عبداللہ یوسف علی مرحوم کا یہ اندازہ غالباً صحیح ہو کہ بنی اسرائیل پر
مظالم قبطی النسل فرعون نے کئے، لیکن وہ غرق شدہ فرعون کو بھی غالباً قبطی النسل فرعون
سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ حضرت موسیٰؑ کو قبطی النسل فرعون کا معاصر قرار دیتے ہیں، اور قبطی النسل
فراعنہ کے جو آثار مل گئے ہیں، ان میں کسی فرعون کے غرق کا ذکر اب تک
نہیں ملا ہے، اور کسی مذہبی روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت موسیٰؑ

کسی فرعون کا ذکر ملتا ہے، اگر وہ کون
کسی قبطی النسل فراعنہ کے معاصر تھے، جو غرق ہو گیا، صرف کسی فرعون کا ذکر ملتا ہے، اگر وہ کون
تھا اس کی صراحت کہیں نہیں ملتی، پھر وہ صورت کیوں نہ مانی جائے کہ جس کا ذکر اوپر میں نے
کیا ہے، کہ ہک سوسی نسل کا آخری فرعون حضرت موسیٰؑ کا معاصر تھا، اور وہی غرق ہوا، اور
بنی اسرائیل کا مکمل اخراج قبطی النسل فراعنہ کے زمانہ میں ہوا، اور ہک سوسی فراعنہ کے آثار
ناپید ہو گئے، اس لئے حضرت موسیٰؑ کا اور غرق فرعون کا، اور حضرت یوسفؑ وغیرہ میں سے کسی
کا بھی آثارِ مصر اور تاریخ مصر میں پتہ نہیں چلتا، اس لئے یہودی کسی روایت یا قرآنی کسی بیان
کا انکار اس وجہ سے نہیں کیا جاسکتا کہ تاریخ مصر میں اس کا تذکرہ نہیں، اور آثار مصریہ میں سے
کوئی اثر ان امور کے متعلق نہیں

(باقی)

دار المصنفین کی نئی کتاب

حیاتِ سُلیمان

مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات پر معارف سلیمان نمبر کے شائع ہونے کے بعد ہی
سے شایقین کو حیاتِ شبلی کی طرح جانشین شبلی کی ایک مفصل سوانح عمری کا شدید انتظار تھا، مختلف
حلقوں کی طرف سے اسکے تقاضے بھی ہوتے رہے، الحمد للہ انتظار کی مدت ختم ہو گئی، اور توقع
کے عین مطابق، وہ حیات سلیمان کے نام سے شائع ہو گئی، یہ کتاب ایک مختصر دیباچہ، نو ابواب اور
آخر میں اردو فارسی میں چند نظموں اور تاریخی قطعات اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے، جسمیں معارف کے شذرات
سے ملک و ملت کی فلاح و بہبود و ترقی و اصلاح سے متعلق سید صاحب کے افکار اکٹھا کر دیئے گئے ہیں، شروع
میں بہت مفصل فہرست مضامین بھی ہے، یہ کتاب ہر لحاظ سے حیات شبلی کا مثنیٰ، پر از معلومات اور سید صاحب
کی شخصیت اور انکے اوصاف و کمالات کی آئینہ دار ہے، مؤلفہ شاہ معین الدین احمد ندوی،

قیمت مجلد، غیر مجلد

مطبوعات جدیدہ

مبادی تدبر قرآن، مرتبہ مولانا امین احسن اصلاحی، متوسط تقطیع، کاغذ
کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت مجلد ، پتہ
دار الاشاعۃ الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ، لاہور نمبرا،

مولانا امین احسن اصلاحی کو قرآن مجید کے فہم و تدبر کا عمدہ اور بہتر ذوق اپنے
استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ سے وراثۃً ملا ہے، ان کی تفسیر "تدبر قرآن" جس کی
دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اردو کے تفسیری ذخیرے میں ایک بہت ہی مفید اضافہ
ہے، یہ کتاب اسی تفسیر کا مقدمہ اور قرآنیات کے متعلق چار بلند پایہ مضامین پر مشتمل
ہے، ان میں سے دوسرے اور تیسرے مضامین جو فکری حیثیت سے زیادہ اہم ہیں، پہلی
دفعہ سرائے میر کے رسالہ الاصلاح مرحوم میں اور اس کے بعد کتابی صورت میں
طبع ہو چکے تھے اب مولانا کے دست راست ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ان کو دو
اور نئے مضامین کے ساتھ بڑے اہتمام سے چھاپا ہے، ان میں قرآن کے فہم و تدبر
کے لئے اخلاص نیت و عمل، تقویٰ و طہارت کی ضرورت و اہمیت اور خارجی و داخلی
وسائل بیان کرکے اس کی تردید کی گئی ہے کہ وہ نہایت آسان کتاب ہے، اسلئے
محتاجِ غور و فکر نہیں، اس سلسلہ میں قرآن مجید کے نزول کا مقصد، تلاوت آیات
تزکیہ اور تعلیم، کتاب و حکمت کی تشریح کرکے قرآن میں فکر و نظر کو ضروری

بتایا گیا ہے، آخر میں تفسیر کے بعض قدیم و جدید اصول و نظریات پر تبصرہ و تنقید اور ان اصول تفسیر کا ذکر ہے، جو مصنف کے نزدیک صحیح اور عقل و نقل کے مطابق ہیں قرآن مجید کے طلبہ کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے،

صد رنگ، مرتبین جناب ریاض گوالیاری و قمرالزمان مبارکپوری صاحبان تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۷۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت صہ پتہ جعفر لائبریری، پوسٹ مبارکپور، ضلع اعظم گڈھ،

اعظم گڈھ کے مشہور قصبہ مبارکپور کے چند پرجوش اور باہمت نوجوانوں نے "جعفر لائبریری" قائم کرکے اس کی جانب سے یہ کتاب شائع کی ہے، اس میں دور حاضر کے تقریباً سوا سو شعراء کی ایک ایک غزلیں شامل ہیں، نوجوان اور ترقی پسند شعراء کے ساتھ، مسلم پختہ فن اور بعض قدیم رنگ سخن کے نمایندوں کا کلام بھی دیا گیا ہے، اور چند مشہور گمنام شعراء بھی شریک کیے گئے ہیں، اس اعتبار سے یہ واقعی اسم با مسمیٰ ہے، ہر شاعر کا تعارف اور اسکے کلام کی خصوصیات کا بھی مختصر ذکر ہے، مگر اس انتخاب میں کچھ غیر معروف اور نو مشق شعراء کا کلام بھی آگیا ہے، اور جب کہ بعض معروف اور کہنہ مشق شعراء نظر انداز ہوگئے ہیں، اس سے قطع نظر یہ ادبی پیشکش حوصلہ افزائی کی مستحق ہے،

عربی پروئیشکا، مرتبہ حافظ فضل الرحمٰن صاحب بزمی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت اچھی، صفحات ۴۸، ناشر کارخانہ دار الصحت مئو ناتھ بھنجن اعظم گڈھ،

یہ اس سٹ کا پہلا حصہ ہے، جو ہندی کے ذریعہ عربی سکھانے کے لئے لائق مرتب تیار کر رہے ہیں، اس میں حروف و حرکات کی شناخت اور انکی مشق کرائی گئی ہے، امید ہے کہ نوآموزوں کو عربی سکھانے کے لئے یہ مفید ثابت ہوگی، "ض"

جلد ۱۱۲ ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۳ء عدد ۶

مضامین